تحقیقی مقالہ برائے ایم۔ایس۔اُردو

مستنصر حسین تارڑ کے سفرنامے نیو یارک کے سو رنگ میں تہذیبی اختلافات کا مطالعہ

محقق

افشین جاوید

223-FLL/MSURDU/F17

نگران

ڈاکٹر سائرہ بتول

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو

شعبہ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

Accession No. TH 23957

MS
917.0973
اف م

اردو ادب ۔ سفرنامہ
" " " ۔ امریکہ

304099

Rupees 60 — ۶۰ روپیہ

بیان حلفی

میں مسماۃ افشین جاوید دختر جاوید اقبال رجسٹریشن نمبر 223-FLL/MSURDU/F17 حلفیہ اقرار کرتی ہوں کہ میں نے یہ مقالہ بعنوان "مستنصر حسین تارڑ کے سفرنامے نیویارک کے سورنگ میں تہذیبی اختلافات" برائے حصول سند ایم۔ایس اُردو لکھا ہے۔ اس مقالے میں کسی بھی طرح کے سرقہ سے کام نہیں لیا۔ مکمل اور اصل حوالہ جات دیئے گئے ہیں۔

متذکرہ بالا بیان میرے علم و یقین کے مطابق صحیح و درست تسلیم اور کوئی امر مخفی یا پوشیدہ نہ رکھا گیا ہے۔ تحریر لکھ دی ہے تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آ سکے۔

مقالہ نگار

افشین جاوید دختر جاوید اقبال

13 OCT 2020

محمد نجیب جاوید ولد جاوید اقبال ساکن محلہ ریلوے ڈرائیور
ویسٹریج لائن 631/C راولپنڈی
مرتب بیان حلفی
37405-0299404-1

M. Najeeb

601 — 1946
13/10/2020

الجامعة الإسلامية العالمية
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد
شعبۂ اردو

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ افشین جاوید رجسٹریشن نمبر 223-FLL/MSURDU/F17 نے ایم۔ ایس۔ اُردو کی ڈگری کی تکمیل کے لیے تحقیقی مقالہ بعنوان **"مستنصر حسین تارڑ کے سفرنامے نیو یارک کے سو رنگ میں تہذیبی اختلافات کا مطالعہ"** میری نگرانی میں رقم کیا ہے۔ میں تصدیق کرتی ہوں کہ اس موضوع پر اس سے پہلے کہیں کام نہیں ہوا اور یہ کام سرقے سے پاک ہے۔

نگران: ڈاکٹر سائرہ بتول
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو

انتساب

امی اور ابو کے نام

بسم الله الرحمن الرحيم

پیش لفظ

حمد وثنا اس ربِ ذوالجلال کی جو وحدہ لا شریک ہے، اورخالق الارض و السموت بھی، جس کی عظمت و کبریائی میں کوئی شک نہیں۔ درود و سلام اس رحمۃ اللعالمین پر جو وجہ تخلیق کائنات ہیں۔ جس کی خاطر رب ذوالجلال نے کائنات کو اس خوبصورتی کے ساتھ تخلیق کیا۔ قرآن مجید فرقان حمید جیسی عظیم کتاب کو انسانیت کی رشد و ہدایت کے لیے نازل کیا اور آپ ﷺ کو شرح قرآن قرار دیا۔

ایم فل کا کورس مکمل کرنے کے بعد اگلا قدم مقالہ لکھنے کی طرف تھا۔ اس میں سب سے پہلے موضوع کے انتخاب جیسے مشکل مرحلے سے گزرنا پڑا۔ جس کے لیے دن رات خوب تحقیق کی کیونکہ کوشش یہ تھی کہ تحقیقی کام کی نوعیت کچھ مختلف ہو۔ اس مشکل مرحلے میں نگران ڈاکٹر سائرہ بتول اور ڈاکٹر نجیبہ عارف، وجیہہ ناز اور میری بہترین ساتھی صفیہ شاہد نے بہت رہنمائی کی۔ ان سب کی راہنمائی کے ساتھ موضوع کے انتخاب جیسا مشکل مرحلہ طے پایا۔ اور مجھے تحقیقی کام کے لیے موضوع "مستنصر حسین تارڑ کے سفر نامے نیو یارک کے سو رنگ میں تہذیبی اختلافات" ملا۔

عصر حاضر کے اہم نظریات میں سے ایک نظریہ "تہذیبوں کا تصادم" ہے۔ یہ نظریہ امریکی ماہر سیاسیات سیموئیل فلپس ہنٹنگٹن نے پیش کیا۔ جس کے مطابق مابعد سرد جنگ مستقبل کے جھگڑے تہذیبی اور ثقافتی بنیادوں پر ہوں گے۔ مختلف تہذیبوں میں تصادم اس وقت رونما ہوتا ہے جب ایک غالب تہذیب دوسرے علاقے کی تہذیب و ثقافت کو قبول کرنے کی بجائے ان کی تہذیب کو ختم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنی تہذیب کو زبردستی اپنانے پر مجبور کرے۔ یعنی قانونِ قدرت کے خلاف جائے۔ کیونکہ دنیا میں مختلف تہذیبوں کی موجودگی سے ہی رنگارنگی ہے اور اسی رنگارنگی سے دنیا کی خوبصورتی بھی قائم ہے۔

مستنصر حسین تارڑ نے اپنے سفر نامے میں اسی چیز کو موضوع بناتے ہوئے مشرقی اور مغربی تہذیب کے اختلافات کو بیان کیا ہے۔ یہ مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ جن کی تفصیل کچھ یوں ہے:

پہلا باب سیموئیل فلپس ہنٹنگٹن کی پیش کردہ تھیوری "تہذیبوں کا تصادم" کی تفصیل پر مشتمل ہے جس میں اس کتاب کے اس حصے کی خاص طور پر وضاحت پیش کی گئی ہے جس میں مصنف نے تہذیبی تصادم کی وجوہات کو بیان کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اسی باب میں سفر نامے کے مصنف مستنصر حسین تارڑ کا سوانحی خاکہ اور ان کے تخلیقی کارناموں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

دوسرے باب میں تہذیبی، ثقافتی اور جغرافیائی اختلافات کی وجہ سے پیدا ہونے والے تہذیبی تصادمات کو سفر نامے کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ اس باب میں پہلے سفر نامہ کی بطور صنف ادب مختصر وضاحت کی گئی ہے۔ سفر نامہ نیو یارک کے سو رنگ کا تعارف اور پھر اس سفر نامے میں مشرقی و مغربی تہذیب کے درمیان پیدا ہونے والے اختلافات کا تہذیبی، ثقافتی اور جغرافیائی حوالے سے جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

مقالے کے تیسرے باب میں مختلف مذہب اور عقیدے کی بنا پر پیدا ہونے والے اختلافات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مذہب چونکہ کسی قوم کا اور اس کی تہذیب کا ایک اہم عنصر ہے اس لیے مختلف تہذیبیں رکھنے والے ممالک کے مذہبی عقائد اور رویے بھی مختلف ہوتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ نے ان تمام رویوں اور مذہب کے فرق کی وجہ سے پیدا ہونے والے اختلافات کو سفر نامے میں بیان کیا۔

چوتھے باب میں سیاسی اور معاشی مفادات کے فرق کی وجہ سے پیدا ہونے والے اختلافات کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ مغرب جب اپنی معیشت کو مضبوط کرنے اور اپنے سیاسی مفادات کے تحفظ کے لیے دوسری قوم پر زبردستی اپنی سیاسی پالیسیاں نافذ کرواتا ہے تو اس سامراجی تسلط کی بنا پر بھی تصادمات جنم لیتے ہیں جو بعد میں سنگین شکل اختیار کر جاتے ہیں۔

باب پنجم میں ان تہذیبی اختلافات کی نوعیت اور وجوہات کا مجموعی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

اس مقالے کی تسوید کے دوران معلوم ہوا کہ کسی بھی قسم کے تحقیقی، تنقیدی اور علمی کام کو سرانجام دینا ہرگز آسان مرحلہ نہیں ہے۔ تحقیقی کام کے دوران سب سے اہم مرحلہ مواد کی فراہمی کا ہوتا ہے، دیگر تحقیق کے طالب علموں کی طرح مجھے بھی مطلوبہ مواد تک رسائی اور اس کو جمع کرنے تک بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن ہمت اور لگن اور اساتذہ کی راہنمائی نے آخر اس مرحلے کو بھی بااحسن وخوبی مکمل کروایا۔ اس دوران نگران ڈاکٹر سائرہ بتول نے ہمیشہ ہمت بندھائی اور ایک شفیق استاد کی طرح ہر مشکل قدم پر رہنمائی بھی کرتی رہیں۔

سب سے پہلے شکر اللہ رب العزت کی ذات کا جس کے فضل سے آج یہ تحقیقی کام مکمل ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ میرے والدین کا خصوصی شکریہ جنہوں نے ہر قدم پر میرا ساتھ دیا، انہوں نے مجھ میں علم کا شوق پیدا کیا اور آج میں انہی کی خواہش کی تکمیل کے لیے یہاں تک پہنچی ہوں۔ میرے بڑے بھائی نجیب جاوید کا شکریہ جو اپنی مصروفیات کے باوجود مجھے مختلف لائبریریوں میں لے کر جاتے رہے۔ مواد کی فراہمی سے لے کر مقالے کے پرنٹ نکلوانے تک کے تمام کاموں میں میرے مددگار رہے۔ دونوں بہنوں اقصیٰ جاوید اور انیلا جاوید کا شکریہ جنہوں نے اس تحقیقی کام کی تکمیل میں میری ہمت بندھائے رکھی۔ ہر ممکن کوشش کرتے ہوئے اس کام کی تکمیل میں میری رہنمائی کی۔

اس مقالے کی تسوید کے دوران ہی شادی ہو گئی اپنے سسرال والوں کا خاص طور شکریہ ادا کرنا چاہوں گی جنہوں نے یہ کام مکمل کرنے میں میرا بھرپور ساتھ دیا۔ گھریلو ذمہ داریوں سے فراغت دی تاکہ میں وقت پر اپنا کام مکمل کر سکوں اور ہمیشہ میری حوصلہ افزائی بھی کی۔ میرے شریکِ حیات جنید درانی کا خصوصی شکریہ جنہوں نے میرا بھرپور ساتھ دیا۔ مقالے کی تکمیل کے مراحل میں پیش آنے والی ہر مشکل میں ایک بہترین ساتھی کی طرح ہمیشہ میرے ساتھ کھڑے رہے۔ میری ہمدم صفیہ شاہد کا شکریہ جس نے موضوع کے انتخاب سے لے کر مقالے کی تکمیل تک میری مدد کی۔

اس کے ساتھ ساتھ مقتدرہ قومی زبان، اکادمی ادبیات اور بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کی لائبریری کے سٹاف کا شکریہ جنہوں نے مواد کی فراہمی کے لیے ہر ممکن مدد کی۔

افشین جاوید

جولائی ۲۰۲۰ء

فہرست موضوعات

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
	پیش لفظ	
۱۔	**باب اول:**	
	سیموئیل پی۔ ہنٹنگٹن کے پیش کردہ تہذیبی اختلافات: تجزیاتی مطالعہ	۱
۲۔	**باب دوم:**	
	سفرنامے میں تہذیبی، ثقافتی اور جغرافیائی اختلافات کا تجزیاتی مطالعہ	۳۳
۳۔	**باب سوم:**	
	سفرنامے میں مذہب کی بناپر پیدا ہونے والے اختلافات کا تجزیاتی مطالعہ	۵۲
۴۔	**باب چہارم:**	
	سفرنامے میں مختلف معاشی اور سیاسی مفادات کی وجہ سے پیدا ہونے والے اختلافات کا تجزیاتی مطالعہ	۷۰
۵۔	**باب پنجم:**	
	تہذیبی اختلافات: مجموعی جائزہ	۸۵
	ماحصل	۱۰۳
	کتابیات	۱۰۹

باب اوّل:

سیموئیل پی۔ ہنٹنگٹن کے پیش کردہ
تہذیبی اختلافات: تجزیاتی مطالعہ

باب اوّل:

سیموئیل پی۔ ہنٹنگٹن کے پیش کردہ تہذیبی اختلافات: تجزیاتی مطالعہ

تہذیب کی تعریف:

تہذیب ایک خالص انسانی تخلیق ہے اور انسان ہی اس کا واحد ضامن ہے۔ تہذیب اور انسان لازم وملزوم حقیقتیں ہیں یعنی انسان کے بغیر تہذیب کا وجود ممکن نہیں اور تہذیب کے بغیر انسان، انسان کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ تہذیب انسان کی انفرادیت ہے اور یہی انفرادیت اسے جانوروں سے نوعی اعتبار سے ممتاز کرتی ہے۔

لفظ "تہذیب" عربی زبان کا لفظ ہے۔ انگریزی زبان میں اس کے لیے Civilization کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ یونیورسل انگلش ڈکشنری *Universal English Dictionary* میں معاشرتی، اخلاقی اور ذہنی نشوونما کو تہذیب کا نام دیا گیا ہے:

A state of social, moral, intellectual and Industrial development.[1]

دی ورلڈ بک ڈکشنری *The World book Dictionary* میں تہذیب کے معنی یوں بیان کیے گئے ہیں:

Civilized condition, advanced stage in Social development.[2]

سیموئیل پی۔ ہنٹنگٹن نے اپنی کتاب میں "تہذیب" کی تعریف یوں بیان کی ہے:

Human history is the history of civilizations. It is impossible to think of the development of humanity in any other terms.[3]

یعنی ہنٹنگٹن کے مطابق انسانی تاریخ تہذیبوں کی تاریخ ہے۔ انسانیت کے ارتقا کے سلسلے میں دوسرے خطوط پر سوچنا ناممکن ہے۔ جرمن فلسفیوں کے مطابق تہذیب ایک ثقافتی اکائی ہے جو کہ میکانیات، ٹیکنالوجی اور مادی قوتوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ سیموئیل پی۔ ہنٹنگٹن کے مطابق:

.... A civilization is a cultural entity.... Which involved mechanics technology and material factors.[4]

یعنی تہذیب ایک ثقافتی وجود ہے، جس میں ٹیکنالوجی، میکنکس اور مادی عوامل شامل ہیں۔ یعنی وہ تمام چیزیں جو انسانی زندگی کو بہتر انداز میں گزارنے کے لیے لازم ہیں وہ تمام عوامل تہذیب کا حصہ ہیں۔

تہذیب سے مراد بنی نوع انسان کا زندگی گزارنے کا طریقہ کار ہے۔ تہذیب کسی بھی معاشرے میں انفرادی طور پر نہیں بلکہ اجتماعی طور پر پروان چڑھتی ہے اس لیے یہ ہماری زندگی کی ایک اہم اکائی ہے۔ زندگی گزارتے ہوئے انسان اپنی روایات کے ساتھ جیتا ہے۔ ایک تہذیب کا دوسری تہذیبوں سے بھی واسطہ رہتا ہے اور ہمیشہ انسانی زندگی پر اس واسطے کے اثرات مرتب ہوتے رہتے ہیں۔ تہذیب ہمیشہ مخصوص ہوتی ہے کیونکہ سماج کی تبدیلی سے تہذیب بھی نئے رنگوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ ایک مخصوص سماج کی اپنی مخصوص تہذیب ہوتی ہے۔ لہذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ پاکستانی سماج اور امریکی سماج اپنی الگ الگ تہذیبیں رکھتے ہیں۔ تہذیب کا تعلق سماج سے ہوتا ہے اور فرد کسی بھی سماج کا ایک اہم حصہ ہوتا ہے۔ اگر تہذیب کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے تو ان میں عقائد، رسم و رواج، مذہبی عبادات، سماجی تعلقات، علم و ادب، فنون اور اخلاقی اصول کسی بھی تہذیب کی خصوصیات کو اجاگر کرتے ہیں۔

سبطِ حسن اپنی کتاب پاکستان میں تہذیب کا ارتقا میں تہذیب کی تعریف کچھ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> کسی معاشرے کی بامقصد تخلیقات اور سماجی اقدار کے نظام کو تہذیب کہتے ہیں۔ تہذیب معاشرے کی طرزِ زندگی اور طرزِ فکر و احساس کا جوہر ہوتی ہے۔ چنانچہ زبان، آلات و اوزار کی پیداوار کے طریقے اور سماجی رشتے، رہن سہن، فنونِ لطیفہ علم و ادب، فلسفہ و حکمت، عقائد، اخلاق و عادات، رسوم و روایات، عشق و محبت کے سلوک اور خاندانی تعلقات وغیرہ تہذیب کے مختلف مظاہر ہیں۔ [۳]

تہذیب عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے لغوی معنی کاٹنا چھانٹنا، تراشنا تاکہ اس میں نئی شاخیں نکلیں، نئی کونپلیں پھوٹیں۔ فارسی میں تہذیب کے معنی آراستن پیراستن، پاک و درست کردن و اصلاح نمود کردن ہیں۔

فیروز اللغات میں لفظ تہذیب کے معنی "آراستگی، صفائی، اصلاح، شائستگی، خوش اخلاقی" درج ہیں۔

اردو زبان میں یہ لفظ شائستگی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً جب یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص بڑا مہذب

یا تہذیب یافتہ ہے تو اس سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ مذکور شخص کا بات چیت کرنے، اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے کا انداز اور رہن سہن کا طریقہ ہمارے روایتی معیار کے مطابق ہے۔

تہذیب کے حوالے سے جازب قریشی اپنی کتاب شاعری اور تہذیب میں لکھتے ہیں کہ:

> ہر انسانی معاشرہ اپنی تہذیب سے پہچانا جاتا ہے۔ تاریخ کے سفر میں ہم نے اپنی آسانی کے لیے اس بات کا تعین کر لیا ہے کہ قدیم عہد کا انسان "وحشی" تھا اور پھر تمدن اور تہذیب کی کرنوں نے اسے "مہذب" بنا دیا۔ لیکن "بشریات" کی دنیا ہمیں اس فضا میں لے جاتی ہے جس میں قدیم انسان کو وحشی اور اس کے معاشرے کو بے تہذیب کہنے پر ہمیں خود ندامت محسوس ہونے لگتی ہے اور ہم سوچتے ہیں کہ بے تہذیب ہونا شائد اتنا برا نہیں جتنا بد تہذیب ہونا ہے۔[۲]

تہذیب سے مراد اقدار کا ایسا نظام ہے جو مختلف سطحوں پر معاشرے کے رویے کی تشکیل کرتا ہے جبکہ ثقافت انسان کے بنائے ہوئے ماحول میں نظر آتی ہے۔ تہذیب معاشرے کا دماغ ہے اور ثقافت جسم ہے۔

کسی بھی خطے کا ادب اس کی تہذیبی خصوصیات کا مظہر ہوتا ہے۔ مثلاً اسلامی ممالک میں تحریر ہونے والا ادب اسلامی تہذیب کا عکس پیش کرے گا اور مغرب میں تحریر ہونے والا ادب مغربی تہذیب کی رنگینیوں کو پیش کرے گا۔ پاکستانی تہذیب اور امریکی تہذیب میں ہمیشہ اختلافات رہے ہیں۔ ان اختلافات کی بنیادی وجہ ان تہذیبوں کے فلسفیانہ افکار ہیں۔ ایک فلسفہ فکر کے مطابق اسلامی تہذیب کی بنیاد روحانیت کے افکار و نظریات پر قائم ہے جبکہ دوسرے فلسفہ فکر کے مطابق مغربی تہذیب کی بنیاد مادیت پرستی پر قائم ہے۔ مغربی تہذیب نے مذہب سے رشتہ توڑ کر اور روحانیت سے منہ موڑ کر ایسی تہذیب کی بنیاد رکھی ہے جسے لادینیت اور مادیت پرستی کی دیمک چاٹ رہی ہے۔ مغربی ممالک صنعتی لحاظ سے تو ترقی یافتہ ہیں مگر ان کی اخلاقی اقدار زوال پذیر ہوتی جا رہی ہیں۔ اخلاقی اقدار کے اس زوال کے نتیجے میں شہوت پرستی اور روحانی افلاس نے جنم لیا ہے۔ بچے یتیم خانوں میں پرورش پاتے ہیں اور بوڑھے ماں باپ اولڈ ہومز میں اپنی آخری سانسیں لینے پر مجبور ہیں۔

جب ادب کسی سرزمین کے تہذیبی منظر نامے کو پیش کرتا ہے تو بعض اوقات تہذیبوں کے اختلافات ادب کا اہم موضوع بن جاتے ہیں۔ مابعد نو آبادیاتی عہد کا ادب جو تیسری دنیا میں تخلیق ہو رہا ہے اس میں تہذیبوں کے اختلافات پر مشتمل بیانیہ ملتا ہے۔

ہر قوم کی اپنی ایک الگ تہذیب ہوتی ہے جو اس کی الگ شناخت کی وجہ بنتی ہے۔ اسی حوالے سے سبطِ حسن اپنی کتاب پاکستان میں تہذیب کا ارتقا میں لکھتے ہیں:

> ہر قوم کی ایک تہذیبی شخصیت ہوتی ہے۔ اس شخصیت کے بعض پہلو دوسری تہذیبوں سے ملتے جلتے ہیں۔ لیکن بعض ایسی انفرادی خصوصیات ہوتی ہیں جو ایک قوم کی تہذیب کو دوسری تہذیبوں سے الگ اور ممتاز کرتی ہیں۔ ہر قومی تہذیب اپنی انہی انفرادی خصوصیات سے پہچانی جاتی ہے۔ [۷]

ہر قوم کی الگ تہذیب اور اس کی انفرادی خصوصیات اس کی پہچان کا ذریعہ بنتی ہے۔ یہ اسے ایک علیحدہ شناخت عطا کرتی ہے جس کی وجہ سے اس قوم کا انفرادی وجود نظر آتا ہے جو اسے دوسری قوموں سے ممتاز کرتا ہے۔

کتاب *The Clash of Civilizations* کا تعارف:

تہذیبوں کے اسی فرق کی کو دیکھتے ہوئے انگریز مصنف سیموئیل پی۔ ہنٹنگٹن نے ۱۹۹۳ء میں ایک مقالہ بعنوان *The clash of Civilizations* لکھا۔ جو امریکی جریدے فارن افیئرز میں شائع ہوا۔ جریدے کے مدیروں کے مطابق ۱۹۶۶ء کے بعد یہ مضمون سب سے زیادہ بحث و مباحثے کا موضوع بنا۔

سیموئیل فلپس ہنٹنگٹن ۱۸ اپریل ۱۹۲۷ء کو امریکہ کے شہر نیویارک میں پیدا ہوئے، ۲۴ دسمبر ۲۰۰۸ء کو طویل علالت کی بعد ان کا انتقال ہوا۔ ہنٹنگٹن ایک امریکی ماہر سیاسیات اور مشیر تھے۔ ہنٹنگٹن بہت سی کتابوں اور عالمانہ مضامین کے مصنف بھی ہیں۔ ہنٹنگٹن تقریباً نصف صدی تک ہارورڈ یونیورسٹی سے منسلک رہے جہاں ہارورڈ سینٹر برائے بین الاقوامی معاملات کے ڈائریکٹر اور یونیورسٹی پروفیسر رہے۔ جمی کارٹر کی صدارتی مدت کے دوران ہنٹنگٹن نیشنل سیکورٹی کونسل کی سیکورٹی منصوبہ بندی کے لیے وائٹ ہاؤس کو آرڈینیٹر بھی رہے۔

ہنٹنگٹن کو ۱۹۹۳ء میں اپنے پیش کردہ نظریے *The Clash of Civilizations* کی وجہ سے شہرت حاصل ہوئی۔ اس شہرت کی وجہ اس مضمون میں پیش کیے جانے والے خیالات و نظریات ہیں۔ تہذیبوں کے تصادم کے حوالے سے یہ نظریہ ہنٹنگٹن نے سب سے پہلے ۱۹۹۲ء اپنے ایک لیکچر میں پیش کیا۔ اس کے بعد امریکی جریدے "فارن افیئرز" میں ایک مقالے کی صورت میں سامنے آیا۔ اس کے بعد ہنٹنگٹن نے اپنے ایک طالب علم فرانسس فوکویاما کی کتاب *The End of History and the last Man* کے جواب میں اس

آرٹیکل کو ۱۹۹۶ء میں کتابی شکل میں بعنوان *The Clash of Civilizations and the Remaking or World Order* پیش کیا۔

اپنی اس کتاب میں مصنف، سرد جنگ کے بعد نیا عالمی نظام کیا ہو گا؟ کے حوالے سے بات کرتے ہیں۔ ہنٹنگٹن کا ماننا ہے کہ مستقبل میں جنگیں ممالک کے درمیان نہیں بلکہ تہذیبوں کے درمیان لڑی جائیں گی۔ ان کے مطابق تہذیبوں کے اختلاف سے پوری دنیا میں تضاد پیدا ہو جائے گا۔ انہوں نے اس تصور کو بھی رد کیا ہے کہ تمام اقدار آفاقی (یونیورسل) ہیں یا ان اقدار کو آفاقی بنایا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سیموئیل نے انفرادی اور ریاستی شناخت کی تشکیل میں مذہب اور کلچر کے بارے میں بھی پیش گوئی کی ہے۔ ان کے مطابق تہذیبوں کے درمیان تصادم عالمی امن کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے۔ اس میں وہ اسلامی تہذیب اور چینی تہذیب کو سب سے بڑا خطرہ سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ دنیا پر مغربی تسلط کے درمیان سب سے بڑی رکاوٹ اسلام ہو گا۔ تاہم یہ اصطلاح "تہذیبوں کا تصادم" برنارڈ لیوس (Bernard Lewis) نے اپنے ایک مضمون بعنوان "مسلمانوں میں غیض و غضب کی وجوہات" (The Roots of Muslim Rage) میں سب سے پہلے استعمال کی، جو ماہنامہ اٹلانٹک (The monthly Atlantic) کے شمارہ بابت ستمبر ۱۹۹۰ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ The Clash of Civilizations کی اصطلاح "ثقافتی تصادم Clash of Cultures" سے حاصل ہوئی جو کہ نو آبادیاتی عہد میں استعمال ہوتی تھی۔

سابق ایرانی صدر محمد خاتمی نے اس نظریے کے جواب میں "تہذیبوں کے درمیان مکالمے" (Dialogue among civilization) کے تصور کو پیش کیا۔ صدر خاتمی کی اس اصطلاح کو بہت زیادہ پذیرائی اور قبولیت اس وقت ملی جب اقوام متحدہ نے سال ۲۰۰۱ء کو تہذیبوں کے درمیان مکالمے کا سال قرار دیا۔

ہنٹنگٹن نے سرد جنگ کے بعد عالمی سیاست کی نوعیت کے بارے میں مختلف نظریات جانچنے کے بعد تہذیبی تصادم کے حوالے سے سوچنا شروع کیا۔ کچھ مصنفین نے یہ دلائل اور نظریات دیئے کہ انسانی حقوق، آزاد خیال جمہوریت، اور سرمایہ دارانہ نظام کی معیشت ہی سرد جنگ کے خاتمے کے بعد دنیا میں قوموں کے لیے واحد نظریاتی متبادل ہے۔ بالخصوص فرانسس فوکویاما Francis fukuyama نے دلیل دی ہے کہ دنیا ہجرت کے احساس میں "تاریخ کے اختتام End of History" تک پہنچ گئی ہے۔ جبکہ ہنٹنگٹن کا اس بات پر یقین ہے کہ جب

نظریات کی عمر ختم ہو جاتی ہے تو دنیا ایک نئے تنازعے کی طرف اشارہ کرتی ہے جو کہ "ثقافتی تنازعہ Culture Conflict" ہے۔ اپنے مقالے میں وہ دلائل دیتے ہیں کہ مستقبل میں تنازعہ کا بنیادی محور "ثقافتی سطح Cultural Lines" ہو گی۔ ہنٹنگٹن کا مزید کہنا ہے کہ مختلف تہذیبوں کا تصور ثقافتی شناخت کے تنازعہ کے امکانات کا تجزیہ کرنے کے لیے مفید اور کارآمد ثابت ہو گا۔ ۱۹۹۳ء میں "فارن افیئرز" میں لکھے گئے مقالے *The Clash of Civilizations* کے اختتام پر ہنٹنگٹن نے لکھا ہے کہ:

> This is not to advocate the desirability of conflicts between Civilizations. It is to set forth descriptive Hypotheses as to what tbe future may be like.[۸]

یعنی یہ تہذیبوں کے درمیان تنازعے کی وکالت نہیں بلکہ مستقبل کس طرح کا ہو سکتا ہے؟ اس وضاحتی نظریے کو قائم کرنے کے لیے ہے۔ اس کے علاوہ تہذیبوں کا تصادم ہنٹنگٹن کے لیے تاریخ کی ترقی کی طرف اشارہ یا اس کی نمائندگی کرتا ہے۔

تہذیبیں تصادم کی وجہ کیوں بنیں گی؟ اس کی کچھ وجوہات ہنٹنگٹن نے اپنے مقالے میں بیان کی ہیں جو کہ درج ذیل ہیں:

پہلی وجہ یہ بتائی کہ تہذیبی شناخت میں دن بہ دن اضافہ ہو تا جا رہا ہے جو کہ تہذیبوں کے درمیان تنازعہ یقینی بنائیں گے۔ کیونکہ تہذیبوں میں اختلافات بنیادی ہیں کہ تہذیبوں کو تاریخ، زبان، ثقافت اور سب سے اہم بات مذہب کی طرف سے ایک دوسرے سے الگ کیا جاتا ہے۔ تہذیبوں کے درمیان یہ فرق صرف سچ نہیں بلکہ ایک اہم مسئلہ بھی ہے۔

دوسری وجہ بتائی کہ مختلف تہذیبوں کے درمیان باہمی تعلق بڑھ رہا ہے جس کی وجہ سے تنازعات کا امکان بھی بڑھ رہا ہے۔

تیسرے اقتصادی جدیدیت نے لوگوں کو اپنی مقامی شناخت سے نکال لیا ہے۔ یہ ملکی ریاست کی شناخت کو

کمزور کرتا ہے۔ دنیا بھر میں مذہب اس فرق کو بھرنے میں کامیاب ہو رہا ہے۔

چوتھے مغرب کے دوہرے کردار کی وجہ سے تہذیبی شعور زیادہ تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ ایک طرف مغرب اپنی طاقت کی بلندی پر ہے اور دوسری طرف غیر مغربی تہذیبوں میں اپنی بنیاد کی طرف واپسی کا رجحان بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ یعنی وہ مغربی تسلط سے نکلنا چاہتی ہیں۔

پانچویں تہذیب تبدیل یا تقسیم نہیں کی جاسکتی اور نہ ہی اس کا کوئی متبادل مل سکتا ہے۔ جیسے ایک روسی شخص کیمونسٹ سے جمہوری تو ہو سکتا ہے، غریب امیر بن سکتا ہے لیکن اس کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ آرمینی بن جائے۔

چھٹے علاقائی اقتصادی سرگرمیاں اس نئی دنیا میں بڑھ رہی ہیں۔ علاقائی اقتصادی نظام اس وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب اس کی جڑیں عام تہذیب سے جڑی ہوں۔

سیموئیل پی۔ ہنٹنگٹن کی کتاب

The Clash of Civilizations and the Remaking of World Order کا اردو ترجمہ محمد احسن بٹ نے تہذیبوں کا تصادم کے نام سے کیا جسے جنوری ۲۰۰۳ء میں مثال پبلشنگ اردو بازار لاہور نے شائع کیا۔

پہلے پہل ہنٹنگٹن نے اپنے مقالے میں یہ سوال اٹھایا تھا کہ کیا عالمی سیاست کے مستقبل میں تہذیبوں کے درمیان جھگڑے چھائے رہیں گے؟ اس کتاب میں انہوں نے اپنی طرف سے اس سوال کا جواب پیش کیا ہے کہ تہذیبوں کے درمیان تصادم عالمی امن کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہیں نیز انہوں نے بتایا کہ تہذیبوں کی بنیاد پر تشکیل دیا گیا بین الاقوامی نظام جنگ سے بچاؤ کا واحد وسیلہ ہے۔

گزشتہ چند برسوں میں رونما ہونے والے واقعات نے ہنٹنگٹن کی پیش گوئیوں کو سچ ثابت کر دیا ہے۔ لوگ زیادہ سے زیادہ خود کو اپنے آباؤ اجداد، زبان، مذہب اور رسم و رواج کی بنیاد پر شناخت کر وا رہے ہیں۔ سرد جنگ کے

بعد کی دنیا میں لوگوں کے درمیان واضح تقسیم و تفریق نظریاتی یا معاشی نہیں بلکہ ثقافتی ہے۔ عالمی سیاست ثقافتی خطوط پر نئے سرے سے تشکیل پا رہی ہے۔

۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے واقعات کے بعد بہت لوگوں کو محسوس ہوا کہ ہنٹنگٹن نے جو کچھ کہا تھا وہ بالکل درست تھا۔ افغانستان اور عراق پر جنگ تھوپنے کے عمل کو تہذیبی ٹکراؤ سے تعبیر کیا گیا۔ جرمن جغرافیہ دان البرٹ کولب کے مطابق قومی تاریخ کی تشکیل میں مذہب سے کہیں بڑھ کر معاشرت اور معیشت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

ہنٹنگٹن نے واضح کیا کہ مسلم ممالک میں آبادی کا دھماکہ خیز اضافہ اور مشرقی ایشیا کا معاشی ابھار عالمی سیاست پر کس طرح اثر انداز ہو رہا ہے۔ ان تبدیلیوں نے مغربی بالا دستی کو چیلنج کیا ہے۔ نام نہاد مغربی آفاقی تصورات کی مخالفت کو فروغ دیا ہے اور نیوکلیائی ہتھیاروں کے پھیلاؤ، ترکِ وطن (امیگریشن) انسانی حقوق اور جمہوریت جیسے مسائل کے حوالے سے تہذیبی اختلافات پیدا ہوئے ہیں۔ مسلم آبادی کے اضافے نے پورے یوریشیا میں متعدد چھوٹی چھوٹی جنگیں برپا کروائی ہیں اور چین کا ابھار تہذیبوں کی عالمی جنگ کی طرف لے جا سکتا ہے۔ ہنٹنگٹن مغرب کو اس کی منفرد ثقافت کو محفوظ رکھنے کے لیے ایک منصوبہ بندی پیش کرتے ہیں اور باقی تمام ملکوں کے لوگوں پر زور دیتے ہیں کہ وہ ایک پیچیدہ، کثیر قطبی اور کثیر تہذیبی دنیا میں مل کر جینا سیکھیں۔

"تہذیبوں کا تصادم اور بین الاقوامی نظام کی تشکیل نو" عصر حاضر میں اور اگلی صدی میں عالمی سیاست کو چلانے والی قوتوں کا تجزیہ کرتی ایک کتاب ہے۔ یہ یقینی طور پر اس عشرے کی سب سے زیادہ موضوعِ بحث بننے والی کتابوں میں سے ایک ہے۔

اس کتاب کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جن کو درج ذیل عنوانات دیئے گئے ہیں:

حصہ اول: تہذیبوں کی دنیا (A World of Civilizations)

حصہ دوم: تہذیبوں کا بدلتا ہوا توازن

(The Shifting Balance of Civilizations)

حصہ سوم: تہذیبوں کا ابھرتا ہوا نظام

(The Emerging Order of Civilizations)

حصہ چہارم: تہذیبوں کے تصادم (Clashes of Civilizations)

حصہ پنجم: تہذیبوں کا مستقبل (The Future of Civilizations)

ان پانچوں حصوں کے کل بارہ ابواب میں مصنف نے اس بنیادی مفروضے کو تفصیل سے بیان کیا ہے کہ سرد جنگ کے ختم ہو جانے کے بعد عالمی سیاست معاشی اور تہذیبی بنیادوں پر از سرِ نو صورت پذیر ہو رہی ہے۔ تہذیب اور ثقافت ہی وہ مرکزی نقطہ ہے جس کے ارد گرد ملکوں کے باہمی تعلقات پنپ رہے ہیں، خواہ ان کی نوعیت دوستی کی ہو یا مخاصمت کی، تعاون کی ہو یا تضاد کی نیز یہ کہ ملکوں میں معاشی، سیاسی اور فوجی اتحاد ہو رہے ہیں جو کہ ایک ہی ثقافتی اور تہذیبی پس منظر رکھتے ہیں۔

کتاب کے پہلے باب میں مصنف نے اس حوالے سے لکھا ہے:

> اس کتاب کا مرکزی خیال یہ ہے کہ ثقافت اور ثقافتی تشخص، جو کہ وسیع ترین سطح پر تہذیبی تشخص ہوتے ہیں، سرد جنگ کے بعد کی دنیا میں تعاون، مخاصمت اور جھگڑوں کے تانے بانے کو تشکیل دے رہے ہیں۔ اس کتاب کے پانچوں حصوں میں اسی مرکزی مفروضے کی جزئیات پر بحث کی گئی ہے۔[9]

سیموئیل فلپس ہنٹنگٹن کی اس کتاب کے ہر حصے کا تعارف کچھ اس طرح ہے:

پہلا حصہ:

اس حصے میں مصنف نے عالمی سیاست کی تشکیل اور اس میں مغرب کے کردار کو موضوع بنایا۔ تاریخ میں پہلی مرتبہ عالمی سیاست کثیر قطبی اور کثیر تہذیبی ہو رہی ہے۔ جدیدیت مغربیت سے ممتاز ہے اور نہ تو یہ کسی بھی بامعنی انداز میں ایک آفاقی تہذیب کو تشکیل دے رہی ہے اور نہ ہی غیر مغربی معاشروں کو مغربی بنا رہی ہے۔

دوسرا حصہ:

تہذیبوں کے درمیان قوت کا توازن تبدیل ہو رہا ہے۔ مغرب اثر و رسوخ کے حوالے سے زوال پذیر ہے، ایشیائی تہذیبیں اپنی معاشی، فوجی اور سیاسی قوت کو بڑھا رہی ہیں۔ اسلام کی آبادی دھماکہ خیز انداز میں بڑھ کر مسلم ملکوں اور ان کے ہمسایوں کے لیے عدم استحکام کا سبب بن رہی ہے۔ نیز غیر مغربی معاشرے عمومی طور پر اپنی ثقافت کی قدر کا از سرِ نو اثبات کر رہے ہیں۔

تیسرا حصہ:

تہذیبوں کی بنیاد پر استوار ایک عالمی نظام ابھر رہا ہے۔ ایک جیسی ثقافت کے حامل معاشرے ایک دوسرے سے تعاون کر رہے ہیں۔ معاشروں کو ایک تہذیب سے دوسری میں تبدیل کرنے کا عمل ناکامیاب رہا ہے اور ملک مرکزی ریاستوں یار ہنما ملکوں کے گرد متحد ہو رہے ہیں۔

چوتھا حصہ:

مغرب کی نام نہاد آفاقیت نے اسے دوسری تہذیبوں کے ساتھ جھگڑوں میں ملوث کر دیا ہے، سب سے سنگین نوعیت کے جھگڑے اسلام اور چین کے ساتھ رونما ہوئے ہیں، مقامی سطح پر تقسیمی خط کی جنگوں نے ، خصوصاً مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے درمیان ""برادری کے ملکوں پر اعتماد" کے رویے کو ابھارا ہے، ان جنگوں کے پھیلنے کا خطرہ بڑھا ہے نیز ان جنگوں کو روکنے کے لیے مرکزی ریاستوں کی کوششوں میں اضافہ ہوا ہے۔

پانچواں حصہ:

مغرب کی بقا کا انحصار اس بات پر ہے کہ امریکی اپنے مغربی تشخص کا دوبارہ اثبات کریں نیز مغربی اپنی تہذیب کو آفاقی کے بجائے منفرد تصور کریں اور غیر مغربی معاشروں سے درپیش چیلنجوں کے مقابلے میں اس کے احیاء اور تحفظ کے لیے متحد ہوں۔ تہذیبوں کی عالمی جنگ سے بچنے کا انحصار اس بات پر ہے کہ عالمی لیڈر عالمی سیاست کے تہذیبی روپ کو تسلیم کریں اور اس کو برقرار رکھنے کے لیے باہمی تعاون کریں۔

کتاب کے پانچوں حصوں کے مختصر تعارف میں مصنف نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے درج ذیل حقائق سامنے آتے ہیں:

امریکی اسکالر تاریخ میں پہلی مرتبہ دنیا کو مغرب کی حدود سے باہر ماننے لگے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد انہیں احساس ہوا کہ دنیا کثیر تہذیبی ہے اور عالمی سیاست بھی کثیر قطبی ہو گئی ہے۔ سرد جنگ کے

دوران بھی دنیا کثیر تہذیبی تو ضرور تھی یہ اور بات کہ مغرب کے اسکالروں کو مغربی تہذیب کے علاوہ کسی اور تہذیب کے وجود کا علم نہیں تھا یا وہ کسی دوسری تہذیب کو تسلیم نہیں کرنا چاہتے تھے۔

ہنٹنگٹن نے اپنی کتاب میں دنیا میں آٹھ بڑی تہذیبوں کی نشاندہی کی ہے جن میں درج ذیل تہذیبیں شامل ہیں:

۱۔ چینی ۲۔ جاپانی ۳۔ ہندو ۴۔اسلامی ۵۔
آرتھوڈوکس ۶۔ مغربی ۷۔ لاطینی امریکی ۸۔افریقی

تہذیبوں کے تصادم کے حوالے سے پیش کیے گئے اس نظریے پر، ہنٹنگٹن کو بہت سی تنقید کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ جیسے حذافہ رفیق نے اپنے مقالے عصری تہذیبی تصادم اور فکرِ اقبال کا تجزیاتی مطالعہ میں ہنٹنگٹن کے اس نظریے کو اسلامی تعلیمات کے منافی قرار دیا ہے۔ کیونکہ ان کا کہنا ہے کہ ہنٹنگٹن نے حتمی طور پر اسلام کو مغرب کا دشمن قرار دیا ہے۔ اپنے مقالے کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ:

> تہذیبوں کے تصادم کے نظریے کی حقیقت یہ ہے کہ یہ محض ایک واہمہ ہے اور مغرب کی ذہنی سوچ کی عکاسی کرتا ہے کہ وہ اسلام کے بارے میں جن خطوط پر سوچتا ہے۔ مغرب کا ایک خوف ہے جو اس کو لاحق ہے کہ اس کی تہذیب روبہ زوال ہے۔۔۔[۱۰]

یعنی وہ ہنٹنگٹن کے اس نظریے کو اہلِ مغرب کے ایک وہم اور خوف کے سوا اور کچھ نہیں سمجھتے۔ ایسا خوف جو انہیں اسلامی تہذیب سے لاحق ہے کہ اسلامی تہذیب اپنی عالمگیر خصوصیات کی بنا پر تمام دنیا پر اپنا ایک اثر قائم کر دے گی جس کی وجہ سے مغربی تہذیب جس کی نہ تو کوئی بنیاد ہے اور نہ ہی کوئی ایسی خصوصیات جس کی وجہ سے وہ اپنا آپ باقی دنیا کے سامنے منوا سکے، زوال کا شکار ہوتی چلی جا رہی ہے۔

جبکہ اس کتاب کو سراہتے ہوئے ہنری اے۔ کسنجر کا کہنا ہے کہ:

> مغربی دنیا کے انتہائی ممتاز عالم سیاسیات سیموئیل ہنٹنگٹن نے اکیسویں صدی میں عالمی سیاست کے حقائق کو سمجھنے کے لیے بہت شاندار نظریاتی ڈھانچہ تشکیل دیا ہے۔ "تہذیبوں کا تصادم اور عالمی نظام کی تشکیل نو" سرد جنگ کے بعد آنے والی اہم ترین کتابوں میں سے ہے۔[۱۱]

ہنری کے مطابق اس کتاب نے عالمی سیاست کی صورتحال اور اس کے مستقبل پر گہری نظر ڈالی ہے۔ اس کتاب میں بتایا گیا کہ عصر حاضر میں اقوام اور نظریات کی جگہ "تہذیبوں" نے لے لی ہے۔

تھیوری The Clash of Civilization:

ہنٹنگٹن کے پیش کردہ نظریے کے مطابق تہذیبوں کے اختلاف سے پوری دنیا میں تضاد پیدا ہو جائے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ سیموئیل نے انفرادی اور ریاستی شناخت کی تشکیل میں مذہب اور کلچر کے کردار کے بارے میں بھی پیش گوئی کی ہے۔ ہنٹنگٹن کے مطابق تہذیبوں کے درمیان تصادم عالمی امن کے لیے ایک بہت بڑا خطرہ ہے۔ ان کے پیش کردہ نظریے کے اہم نکات درج ذیل ہیں جن کے تناظر میں مستنصر حسین تارڑ کے سفر نامے نیو یارک کے سو رنگ میں پاکستانی اور امریکی تہذیب کے درمیان موجود اختلافات کا مطالعہ کیا جائے گا۔

کتاب کے حصہ چہارم میں ہنٹنگٹن "بین التہذیبی مسائل" کے عنوان سے تہذیبوں کے درمیان تصادم کی وجوہات بننے والے عوامل پر بحث کرتے ہیں۔ ہنٹنگٹن کے پیش کردہ نظریے کے اہم نکات درج ذیل ہیں:

☆ تہذیبوں کے اختلافات کی وجہ ثقافتی اقدار کا فرق ہے۔

☆ تہذیبوں کے اختلاف کی وجہ معاشی اور سیاسی مفادات ہیں۔

☆ مذہب کی وجہ سے تہذیبی اختلافات جنم لیتے ہیں۔

☆ تہذیبی اختلافات کی وجہ جغرافیائی حدود ہیں۔

مندرجہ بالا نکات کی تفصیل درج ذیل ہے:

تہذیبوں کے اختلافات کی وجہ ثقافتی اقدار کا فرق:

ثقافت کسی معاشرے میں موجود ان رسم ورواج اور اقدار کے مجموعے کو کہا جاتا ہے جن پر اس کے تمام افراد مشترکہ طور پر عمل کرتے ہوں۔ اس میں مذہب، آرٹ، ادب، رسم ورواج اور اخلاقیات وغیرہ شامل ہیں۔ یہ سب چیزیں جب مختلف ہوں گی تو مختلف ثقافتوں کے حامل ممالک کے درمیان تہذیبی اختلافات کی وجہ بنیں گی۔

ہنٹنگٹن کا کہنا ہے کہ تہذیبوں کے درمیان تنہا مغرب نے ہر دوسری تہذیب پر نمایاں اور گہرا اثر ڈالا ہے۔ نتیجے کے طور پر مغرب کے اقدار اور ثقافت میں رشتہ اور دوسری تہذیبوں کے اقدار اور ثقافت میں رشتہ تہذیبوں کی دنیا میں سب سے زیادہ چھایا ہوا ہے۔ دوسری تہذیبوں سے نسبت رکھنے والی قوت کی حیثیت سے مغربی ثقافت کی کشش کم ہوئی ہے اور غیر مغربی لوگوں نے اپنی ثقافت میں دلچسپی اور وابستگی میں اضافہ کیا ہے۔ نتیجتاً مغرب اور باقی دنیا کے تعلقات میں مرکزی مسئلہ مغرب کا خصوصاً امریکہ کا ایک آفاقی مغربی ثقافت کی تشکیل دینے کی کوشش کرنا ہے۔ لیکن ایسا کرنا دراصل مغرب کا زوال ہے کیونکہ دنیا اب کثیر تہذیبی بن چکی ہے۔ اس کثیر تہذیبی دنیا میں مختلف ثقافتیں اپنا وجود رکھتی ہیں۔

مختلف سطحوں پر مسلمان مفکرین اس بات پر زور دیتے نظر آتے ہیں کہ مغرب کے مقابلے میں اسلامی ثقافت کے ربط کو مضبوط کیا جائے وہ اپنی ثقافت یعنی اسلامی ثقافت کی برتری پر اصرار کرتے ہیں۔ مسلمان اس بات پر متفق ہیں کہ ان کی ثقافت اور مغربی ثقافت میں بنیادی اختلافات موجود ہیں۔ شیخ غنوشی کا کہنا ہے کہ "بنیادی بات یہ ہے کہ ہمارے معاشرے مغرب کے مقابلے میں اقدار پر استوار ہیں"۔

مغرب کا یہ کہنا ہے کہ غیر مغربی لوگوں کو مغرب کی جمہوریت، محدود حکومت، انسانی حقوق، انفرادیت پسندی اور قانون کی حکمرانی جیسی اقدار سے وابستہ ہونا چاہیے اور اپنے اداروں میں بھی مغرب کی ان اقدار کو نافذ کرنا چاہیے۔ دوسری تہذیبوں میں اقلیتیں ان اقدار کو نہ صرف تسلیم کرتی ہیں بلکہ انہیں فروغ بھی دیتی ہیں لیکن ان اقدار کے حوالے سے غیر مغربی ثقافتوں کے اندر غالب رجحان تشکیک پسندی کا ہے جو وسیع اختلاف تک جا پہنچتا ہے۔

مغرب کے اس طرح ہر طرف چھا جانے والے رویے کے متعلق ہنٹنگٹن کا کہنا ہے کہ "مغرب کے لیے جو آفاقیت ہے وہ باقی دنیا کے لیے استعماریت، سامراجیت ہے۔" [۲۱]

یعنی مغرب اپنی جس ثقافت کو آفاقیت کا نام دے کر تمام دنیا پر لاگو کروانا چاہتا ہے وہ دراصل باقی دنیا کے لیے استعماریت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ باقی دنیا مغرب کے اسی رویے کی وجہ سے اس سے خائف ہے۔ کیونکہ دنیا میں مختلف قومیں آباد ہیں اور سبھی اپنی علیحدہ تہذیبیں رکھتی ہیں اور ان اصولوں کے مطابق اپنی زندگی گزارنا چاہتی ہیں۔ جبکہ مغرب ان سب پر اپنا قبضہ جمانا چاہتا ہے، ان کی زندگیوں میں اپنے اصول نافذ کرنا چاہتا ہے۔

مغرب اپنی غالب حیثیت کو برقرار رکھنے کی کوشش کر رہا ہے اور کرتا رہے گا۔ نیز وہ اپنے مفادات کا تحفظ یوں کرے گا کہ انہیں "عالمی برادری" کے مفادات کے طور پر متعارف کروائے گا۔ ایسا کئی دوسری مغربی طاقتیں اپنے مفادات کی خاطر کر چکی ہیں۔

عرصہ پہلے پیداوار کی شرح، معاشی صورتحال اور حکومتی پالیسیوں کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو اپنے آبائی وطن چھوڑنے پڑے۔ تلاشِ روزگار کے سلسلے میں بہت سے لوگوں کو ہجرت کرنا پڑی۔ پچھلے کچھ عرصے سے تارکین وطن کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ تارکین وطن مختلف مغربی ممالک کا سفر کرتے ہیں اور وہاں کام کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ بڑی تعداد میں غیر مغربی لوگوں کے آنے کی وجہ سے مغرب کو اپنی ثقافتی شناخت خطرے میں محسوس لگی۔ مغرب کو یہ خطرہ تھا کہ اب ان پر حملہ فوجوں یا ٹینکوں کی مدد سے نہیں بلکہ تارکینِ وطن کے ذریعے کیا جا رہا ہے۔ وہ تارکینِ وطن جو دوسری زبانیں بولتے ہیں، مختلف مذاہب کے ماننے والے ہیں اور دوسری ثقافتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی وجہ سے مغرب کو یہ خوف ہے کہ ان کا روزگار ختم ہو جائے گا۔ ان کا طرزِ زندگی برباد ہو جائے گا۔

اسی حوالے سے سٹینلے ہوف مین نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ "مغرب کا یہ خوف حقیقی ثقافتی تصادمات اور قومی شناخت کو درپیش پریشانیوں کی پیداوار ہیں۔"[31]

اسلام اور چین عظیم ثقافتی روایات کو تشکیل دیتے ہیں جو مغرب سے بہت مختلف اور ان کی اپنی نگاہوں میں مغرب سے افضل و برتر ہیں۔ مغرب کے ساتھ اقتدار اور مفادات کے حوالے سے تنازع و اختلاف میں اضافہ ہو رہا ہے اور شدت اختیار کر رہا ہے۔ کیونکہ اسلام کی کوئی مرکزی ریاست نہیں ہے لہٰذا ہر ملک کے مغرب کے ساتھ تعلقات جدا ہیں۔

اسلامی اور چینی معاشرے جنہیں مغرب اپنے دشمن کے طور پر دیکھتا ہے مغرب کے خلاف ایک دوسرے سے تعاون کرنے کا جواز رکھتے ہیں۔ یہ تعاون مختلف نوعیت کے معاملات میں رونما ہو سکتا ہے۔ جیسے انسانی حقوق، معیشت اور سب سے زیادہ اہم دونوں معاشروں کی اپنی اپنی فوجی استعداد بڑھانے کی کوششیں کرنا تاکہ مغرب کی روایتی فوجی برتری کا توڑ کیا جاسکے۔

اس طرح جب ایک تہذیب دوسری تہذیب اور ثقافت کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کی بجائے غالب تہذیب ان کو زیر تسلط رکھنے لگے تو تہذیبوں کے درمیان اختلافات پیدا ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔

تہذیبوں کے اختلاف کی وجہ معاشی اور سیاسی مفادات:

جب ایک ترقی پذیر ملک اپنی معیشت کو مضبوط بنانے، اور دوسرے ممالک پر اپنا تسلط قائم رکھنے کے لیے ایسے اقدامات کرتا ہے جو اس کے حق میں تو بہتر مگر دوسرے ممالک کے لیے نقصان دہ ہوتے ہیں، تو اس تسلط کی بنا پر تہذیبی اختلافات جنم لیتے ہیں۔

جیسے مغرب اپنی غالب معیشت کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے مفادات کو "عالمی برادری کے مفادات" کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ اسی طرح کئی دوسری مغربی طاقتیں بھی اپنے مفاد کے لیے کیے گئے کاموں کا "عالمی" جواز مہیا کرتی ہیں۔

اسی طرح آئی۔ایم۔ ایف اور دوسرے بین الاقوامی معاشی اداروں کے ذریعے مغرب اپنے معاشی مفادات کو فروغ دیتا ہے اور دوسری قوموں پر وہ معاشی پالیسیاں نافذ کرواتا ہے جنہیں وہ خود درست سمجھتا ہے اور جو اس کے حق میں بہتر ہوتی ہیں۔

آئی۔ ایم۔ ایف کے بارے میں جارجی آربیٹو کا بیان ہے کہ:

> یہ دوسرے لوگوں کی دولت ضبط کرنے، غیر جمہوری اور عجیب معاشی و سیاسی ضابطوں کو نافذ کرنے اور معاشی آزادی کو سلب کرنے سے محبت کرتے ہیں۔ [۱۴]

بین الاقوامی مالیاتی فنڈ یا (آئی ایم ایف) انٹرنیشنل مونیٹری فنڈ (IMF) یک عالمی مالیاتی ادارہ ہے جو ملکی معیشتوں اور ان کی باہمی کارکردگی بالخصوص زرمبادلہ، بیرونی قرضہ جات پر نظر رکھتا ہے اور ان کی معاشی فلاح اور مالی خسارے سے نبٹنے کے لیے قرضے اور تیکنیکی معاونت فراہم کرتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے بہت سے یورپی ممالک کا توازن ادائیگی کا خسارہ پیدا ہوگیا تھا۔ ایسے ممالک کی مدد کرنے کے لیے یہ ادارہ وجود میں آیا۔ یہ ادارہ جنگ عظیم دوم کے بعد بریٹن وڈز کے معاہدہ کے تحت بین الاقوامی تجارت اور مالی لین دین کی ثالثی کے لیے دسمبر ۱۹۴۵ء میں قائم ہوا۔ اس کا مرکزی دفتر امریکہ کے دارالحکومت واشنگٹن میں ہے۔

بین الاقوامی مالیاتی فنڈ پر بڑی طاقتوں کا مکمل راج ہے جس کی وجہ اس کے فیصلوں کے لیے ووٹ ڈالنے کی غیر منصفانہ تقسیم ہے۔ یہ ادارہ تقریباً تمام ممالک کو قرضہ دیتا ہے جو ان ممالک کے بیرونی قرضہ میں شامل ہوتے ہیں۔ ان قرضوں کے ساتھ غریب ممالک کے اوپر کچھ شرائط بھی لگائی جاتی ہیں جن کے بارے میں ناقدین کا خیال ہے کہ یہ شرائط اکثر اوقات مقروض ملک کے معاشی حالات کو بہتر بنانے کی بجائے اسے بگاڑتے ہیں۔

تاریخی طور پر دیکھا گیا ہے کہ جن ممالک نے مکمل طور پر بین الاقوامی مالیاتی فنڈ کے قرضے حاصل کیے اور ان کے ساتھ ملحق شرائط کو من وعن نافذ کیا وہ معاشی طور پر تباہ ہوگئے۔ یہ بات لاطینی امریکہ کے ممالک پر صادق آتی ہے جن کو بین الاقوامی مالیاتی فنڈ کی شرائط کی وجہ سے ۱۹۸۰ء کی دہائی میں مالیاتی بحران کا شکار ہونا پڑا۔ ۱۹۹۷ء کے جنوب مشرقی ایشیا کے مالیاتی بحران کو بھی ان پالیسیوں کا نتیجہ کہا جاتا ہے جو ان ممالک نے بین الاقوامی مالیاتی فنڈ کے کہنے پر نافذ کیے تھے۔ ترقی پزیر ممالک کو شکایت ہے کہ بین الاقوامی مالیاتی فنڈ غریب ملکوں میں بجلی اور ذرائع رسل ورسائل ومواصلات کی قیمت کے بڑھنے کی ذمہ دار ہے۔ مثلاً پاکستان کو دیے جانے والے قرضوں کے ساتھ جو شرائط رکھی جاتی ہیں ان میں یہ بات بھی شامل ہے کہ ٹیلی فون کی اور بعض دوسری اشیاء مثلاً پٹرول پر ایکسائز ڈیوٹی بڑھائی جائے۔ اس کا براہ راست اثر غریب لوگوں اور غربت پر پڑتا ہے۔

یہ ایک ایسا مالیاتی ادارہ ہے جو کمزور معیشت کے حامل ممالک کو اپنی شرائط پر قرضے فراہم کرتا ہے۔ اور اس قرضے کے بعد اس معیشت کو اپنی شرائط پر اپنے انداز سے چلاتا ہے۔ وہاں کی تمام سہولیات سے اس عوام کو فائدہ دینے کی بجائے ان سہولیات کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتا ہے۔ یعنی اس ملک کی معاشی آزادی کو سلب کرلیتا

ہے۔ یہ ایسے منصوبے بناتا ہے جو تیسری دنیا کے ممالک کے لیے زہر قاتل سے کم نہیں ہوتے۔ اس کے متاثرین میں ارجنٹائن، نائجیریا، نائجر اور صومالیہ بھی شامل ہیں۔

ناقدین کے نزدیک آئی ایم ایف کا کردار ایک بین الاقوامی پولیس والے جیسا ہے۔ آئی ایم ایف غریب ممالک کو جن شرائط پر قرض دیتا ہے وہ درج ذیل ہیں:

- سود کی شرح میں اضافہ کیا جائے۔ اس سے غربت بڑھ جاتی ہے۔
- ٹیکس بڑھایا جائے اور حکومتی اخراجات میں کمی کی جائے۔ اس سے عوامی سہولیات میں کمی آتی ہے اور بے روزگاری بڑھتی ہے۔
- زیادہ سے زیادہ قومی اداروں کی نجکاری کی جائے۔ اس سے ملکی اثاثے غیر ملکیوں کے پاس چلے جاتے ہیں۔
- بین الاقوامی سرمائے کی ملک میں آمد و رفت پر سے تمام پابندیاں ہٹالی جائیں۔ اس سے سٹاک مارکیٹ میں عدم استحکام پیدا ہوتا ہے۔
- بین الاقوامی بینکوں اور کارپوریشنوں کو زیادہ سے زیادہ آزادی دی جائے۔ اس سے ملکی صنعتیں مفلوج ہو جاتی ہیں۔

اس کے بعد ان غریب ممالک کو بس اتنی رقم مزید قرض دی جاتی ہے کہ وہ اپنے موجودہ بین الاقوامی قرضوں کا سود ادا کر سکیں۔ ان اصلاحات کے نتیجے میں ملکی دولت آئی ایم ایف کے پاس چلی جاتی ہے اور یہ سب جمہوریت کی آڑ میں ہوتا ہے۔

سن ۲۰۰۸ء کے بین الاقوامی مالیاتی بحران میں صرف دو ممالک زیادہ متاثر نہیں ہوئے۔ یہ ہندوستان اور چین تھے۔ ان دونوں ممالک میں آئی ایم ایف کا اثر رسوخ بہت کم ہے۔

مغرب کے دوہرے معیار کو اس طرح بھی دیکھا جا سکتا کہ وہ جمہوریت کو فروغ تو دیتے ہیں مگر اس جمہوریت کو نہیں جو بنیاد پرستوں کو اقتدار میں لے آئے۔ کیونکہ وہ بنیاد پرست حکمران مغرب کے اصول و ضوابط کے تحت حکومت نہیں چلاتے اس لیے مغرب دوسرے ممالک کی صرف اس جمہوریت کو پسند کرتا ہے جو مغرب

نواز حکومتوں کو اقتدار میں لائے۔ تاکہ وہ اسے اپنے انداز اور اصول کے تحت چلا سکیں۔ اسی طرح ایران اور عراق کے لیے ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو روکنے کے احکامات جاری کیے جاتے ہیں لیکن اسرائیل کے لیے ایسے احکامات جاری نہیں ہوتے۔ اسی طرح انسانی حقوق صدام حسین کے معاملے میں تو یاد آتے ہیں مگر سعودی عرب کے حوالے سے نہیں۔

مغرب کا یہ ماننا تھا کہ انسانی حقوق کے مغربی تصورات اور سیاسی جمہوریت کی مغربی صورتیں ساری دنیا میں جلد ہی چھانے کو ہیں۔ لہذا مغرب والوں کا ترجیحی مقصد ہی جمہوریت کے اس پھیلاؤ کو فروغ دینا طے پا گیا۔ جس کے لیے مختلف سطحوں پر بہت سے عملی اقدام بھی کیے گئے۔ خارجہ پالیسیوں میں بھی مغربی جمہوریت کے پھیلاؤ کو شامل کیا گیا۔ قدرے کم درجے اور نسبتاً غیر واضح انداز میں انسانی حقوق اور جمہوریت کا فروغ یورپی ریاستوں کی خارجہ پالیسیوں میں بھی شامل ہوتا گیا نیز مغربی کنٹرول والے بین الاقوامی معاشی اداروں کے ترقی پذیر ملکوں کو دیئے جانے والے قرضوں اور گرانٹوں میں بھی۔

۱۹۹۵ء میں ان اہداف کو پانے کی یورپی اور امریکی کوششیں کم کامیاب ہوئیں۔ قریباً ساری ہی غیر مغربی تہذیبیں مغرب کے اس دباؤ کی مزاحمت کرتی ہیں۔ تاہم مغرب کی اپنی پسندیدہ جمہوریت پھیلانے کی کوششوں کی سب سے زیادہ مزاحمت اسلام اور ایشیا نے کی ہے۔

مجموعی طور پر ایشیائی ملکوں کی بڑھتی ہوئی معاشی ترقی نے انہیں انسانی حقوق اور جمہوریت کے حوالے سے بڑھتے ہوئے مغربی دباؤ کے مقابلے میں محفوظ بنا دیا ہے۔

وہ مسائل جو مغرب اور دوسرے معاشروں کو تقسیم کر رہے ہیں، بین الاقوامی ایجنڈا پر رفتہ رفتہ بہت اہمیت اختیار کرتے چلے جا رہے ہیں۔ ایسے تین مسائل جو مغرب کی کوششوں میں شامل ہیں کہ جن کی وجہ سے وہ اپنا تسلط قائم رکھ سکتا ہے درج ذیل ہیں:

۱۔ نیوکلیائی، حیاتیاتی اور کیمیائی ہتھیاروں کو دوسرے ملکوں میں روکنا اور خود ان ہتھیاروں کے پھینکنے کے ذرائع کی تیاری کے حوالے سے نئی پالیسیاں تشکیل دینا تاکہ وہ اپنی فوجی برتری کو برقرار رکھ سکے۔

۲۔ دوسرے معاشروں پر دباؤ ڈال کر مغرب کی سیاسی اقدار کو فروغ دینا۔ انسانی حقوق اور جمہوریت کو مغرب کی طرز پر قبول کرنے کے لیے دباؤ ڈالنا۔

۳۔ مغربی معاشروں کی ثقافتی، سماجی اور نسلی اتحاد و ارتباط کے تحفظ کے لیے غیر مغربی لوگوں کو بطور مہاجر داخلے پر پابندی لگانا۔

ان تین شعبوں میں مغرب کو غیر مغربی معاشروں کے مقابلے میں اپنے مفادات کے دفاع میں مسلسل دشواری کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اسی لیے مغرب ان چیزوں کو بین الاقوامی ایجنڈے کے طور پر تمام معاشروں پر زبردستی لاگو کروانا چاہتا ہے۔

فوجی استعداد کے پھیلاؤ سے عالمی معاشی اور سماجی ترقی ممکن ہو گی۔ جیسے ہی جاپان اور دیگر ایشیائی ممالک معاشی حوالے سے بہتری کی طرف گامزن ہوں گے وہ فوجی حوالے سے بھی طاقتور ہو جائیں گے۔

بطور ایک عالمی طاقت اور غالب تہذیب کے مغرب کا یہ کہنا ہے کہ صرف وہ یعنی بنیادی طور پر امریکہ، فرانس اور برطانیہ کی ہمراہی میں دنیا کے کسی بھی حصے میں فوجی مداخلت کرنے کا اہل ہو گا۔ نیز صرف امریکہ ہی کے پاس اتنی فضائی قوت موجود ہے کہ وہ کہیں بھی بمباری کر سکتا ہے۔

اس لیے بہت سے غیر مغربی ممالک نے اس نہج پر سوچنا شروع کر دیا ہے کہ کس طرح وہ اپنا دفاع بہتر بنا سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ بہت سے ذرائع استعمال کر رہے ہیں جیسے بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں اور ان کو پھینکنے کی صلاحیت کو حاصل کرنا، تاکہ وہ امریکہ کے مقابلے میں اپنا دفاع بہتر بنا سکیں۔ بہت سے ممالک جو علاقائی برتری کے خواہش مند ہیں اور امریکہ کے تسلط سے نکلنا چاہتے ہیں وہ ان ہتھیاروں کو حاصل کرنے میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ اس طرح وہ امریکہ یا دوسری خارجی طاقتوں کی علاقے یا تہذیب میں مداخلت کو روکنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اگر وہ نیوکلیائی ہتھیاروں کو حاصل کر لیتے ہیں تو ان ممالک کا خیال ہے کہ امریکہ ان پر قابض نہیں ہو سکے گا۔ ایک ہندوستانی افسر کے مطابق جب تک تم نیوکلیائی طاقت حاصل نہ کر لو امریکہ سے جنگ نہ لڑو۔ ان کا خیال ہے کہ اگر تم نیوکلیائی ہتھیار رکھتے ہو تو امریکہ تم سے نہیں لڑے گا۔

اب شمالی کوریا، پاکستان اور ہندوستان اپنے میزائلوں کی حد / رینج بڑھا رہے ہیں اور کسی حد تک مغرب کو نشانہ بنانے کی استعداد بھی رکھتے ہیں اور یہ سب مابعد سرد جنگ شروع ہوا۔ عراق کے پاس کیمیائی جنگ کی بڑی استعداد ہے نیز وہ حیاتیاتی اور نیوکلیائی ہتھیار بنانے کی صلاحیت حاصل کرنے کے لیے بڑی کوششیں کر رہا ہے۔

امریکہ اسرائیل میں تو ہتھیار سازی کے خلاف کچھ نہیں بولتا مگر دیگر ممالک میں ہتھیار سازی کے عدم پھیلاؤ کی پالیسی نافذ کرتا ہے تاکہ اس حوالے سے اپنی برتری اور تسلط برقرار رکھ سکے۔

عراق کے ساتھ ساتھ دیگر مسلم ریاستیں بھی نیوکلیائی ہتھیار تیار کرنے میں دلچسپی رکھتی ہیں۔ جن میں لیبیا، الجیریا اور سعودی عرب شامل ہیں۔ ہنٹنگٹن کے مطابق اس حوالے سے چین بہت سی مسلم ریاستوں کو ہتھیار فراہم کرنے میں مدد کر رہا ہے۔ چین پاکستان کو جیٹ، ہوائی جہاز، توپ خانہ اور میزائل تیار کرنے کے لیے پروڈکشن کی سہولیات فراہم کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ چین پاکستان کو نیوکلیائی ہتھیاروں کی صلاحیت کو ترقی دینے میں بنیادی نوعیت کی مدد فراہم کرتا ہے۔

۱۹۹۰ء کی دہائی میں چین اور ایران کے درمیان بھی اسلحے کے حوالے سے تعلقات میں اضافہ ہوا ہے۔

گزرتے سالوں میں چین اور ایران کے درمیان نیوکلیائی تعاون کے حوالے سے کئی معاہدے کیے گئے۔ اسی طرح شمالی کوریا نے بھی ہتھیار سازی کے حوالے سے ایران کی بہت مدد کی ہے۔ ایران اور پاکستان بھی نیوکلیائی شعبے میں تعاون کو وسیع پیمانے پر بڑھانے پر رضامند ہو گئے ہیں جس کے تحت پاکستان ایرانی سائنسدانوں کو ہتھیار سازی کے حوالے سے تربیت فراہم کرے گا۔

ان ملکوں کے اتحاد کی وجہ سے مغرب کو اپنا تسلط خطرے میں محسوس ہوا جس کی وجہ سے بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کی روک تھام کو مغرب کی سلامتی کے ایجنڈے پر سب سے پہلے نمبر پر لے آئے ہیں۔ مغرب نے کئی حربے آزماتے ہوئے غیر مغربی معاشروں کو ہتھیار سازی سے روکنے کی کوششیں کی ہیں مگر ایسا ممکن نہ ہوا۔ بقول ہنٹنگٹن:

> غیر مغربی معاشروں کی معاشی اور سماجی ترقی، ہتھیاروں، ٹیکنالوجی اور مہارت کی فروخت سے دولت کمانے کے تجارتی محرکات نیز مرکزی ریاستوں اور علاقائی طاقتوں کے اپنی مقامی رعایا کو تحفظ دینے کے سیاسی مقاصد، ان سب کی وجہ سے مغرب کی ہتھیار سازی کو روکنے کی کوششیں برباد ہو کے رہ گئی ہیں۔ [۱۵]

تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو روکنے میں مغرب کو محدود حد تک کامیابی حاصل ہوئی مگر یہ کامیابی زیادہ بڑی سطح پر نہ مل سکی۔ ۱۹۹۳ء میں مغرب کے بنیادی مقاصد ہتھیاروں کے پھیلاؤ کی روک تھام سے تبدیل ہو کر جوابی ہتھیار سازی ہو گئے۔ یہ تبدیلی اس بات کا حقیقت پسندانہ اعتراف تھا کہ نیوکلیائی ہتھیاروں کے پھیلاؤ سے گریز نہیں کیا جاسکتا۔

جمہوریت کے حوالے سے مغرب کا نقطہ نظر یہ تھا کہ وہ مغربی جمہوریت کو غیر مغربی ملکوں میں نافذ کروا کر وہاں سے اپنی مرضی کے کام نکلوا سکتے ہیں کیونکہ وہاں کی سیاست کا انداز اور سیاست دان سب ان کی اپنی پسند کے ہوں گے۔ مغرب کا یہ مفروضہ تھا کہ جمہوری طرز حکومت تو مغرب کی دین ہے اس لیے جمہوری انداز سے منتخب شدہ حکومتیں مغرب نواز اور مغرب ہی سے تعاون کرنے والی ہوں گی مگر ایسا ممکن نہ ہوا کیونکہ وہاں اکثر انتخابات میں مغرب دشمن اور بنیاد پرست اقتدار میں آئے اور یوں مغرب اپنے عزائم پورے کرنے اور اپنی اجارہ داری قائم کرنے میں ناکام رہا۔

یوں جب ایک ملک کی طرف سے غیر جانبداری دکھاتے ہوئے اپنے معاشی اور سیاسی مفادات کے حق میں فیصلے کیے جائیں اور دوسرے ممالک کو اپنے زیرِ تسلط رکھنے کے حوالے سے مختلف اقدامات کیے جائیں تو مختلف تہذیبوں کے درمیاں ہم آہنگی کی فضا پیدا ہونے کی بجائے تہذیبی اختلافات پیدا ہونے لگتے ہیں۔

مذہب میں فرق کی وجہ سے تہذیبی اختلافات کا جنم:

مذہب جو کسی بھی ملک کی اہم بنیاد ہے اس میں فرق کی وجہ سے رہن سہن، رسم و رواج اور تہذیب و ثقافت میں فرق آجاتا ہے جو تہذیبی اختلاف کی وجہ بنتا ہے۔

کسی مخصوص علاقے کی مذہبی روایات میں وہاں کے لوگوں کا کائنات کو دیکھنے اور سمجھنے کا انداز کار فرما ہوتا ہے۔ مثلاً زراعتی معاشروں میں بارش کا دیوتا ہوتا ہے تو خانہ بدوش معاشروں میں شکار کا۔ یہ کہنا درست نہیں کہ مذہب اپنے سے متعلقہ علاقہ کے لوگوں کی روحانی ضروریات کو پورا کرتا ہے۔ بلکہ اس کے برعکس یہ کہنا چاہیے کہ کسی

خطہ کے لوگ اپنے روحانی تقاضے پورے کرنے کے لیے جو امتناعات، پابندیاں، اُصول و قوانین، ضوابط وغیرہ عائد کرتے ہیں اُن کا مجموعہ مذہب کہلاتا ہے۔

مذاہب میں فرق کی وجہ سے پیدا ہونے والے تصادمات بہت سنگین نوعیت کے ہوتے ہیں۔ مختلف وجوہات کی بنا پر اپنا ملک چھوڑنے والے مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے مذہبی عقائد، رسم و رواج، زندگی گزارنے کے طور طریقے، ان کی تہذیب و ثقافت سب مختلف ہوتی تھی۔ مذہب کے اس فرق کی وجہ سے بھی ترکِ وطن کرنے والوں سے مغربی لوگ خوفزدہ تھے۔

خاص طور پر ۱۹۹۰ء کی دہائی میں یورپ میں تارکینِ وطن میں زیادہ تعداد مسلمانوں کی تھی جس سے یورپی خوفزدہ تھے کہ کہیں مسلم اکثریت ان پر حاوی نہ ہو جائے اور ان کی اپنی تہذیب و ثقافت کہیں پیچھے نہ رہ جائے۔ کیونکہ مسلم برادری میزبان ملکوں کی ثقافت میں ضم نہیں ہوتی بلکہ اپنی علیحدہ شناخت قائم رکھتی ہے۔ جس کی وجہ سے یورپ والے مسلم برادری سے خاص طور پر خوفزدہ تھے۔ تاریخی واقعات پر اگر نظر ڈالی جائے تو اسلام وہ واحد تہذیب تھی جس نے مغرب کی بقا کو خطرے میں ڈالا۔ ۱۹۲۹ء کے درمیان مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والی دو ریاستوں میں ہونے والی جنگوں میں سے ۵۰ فیصد جنگیں مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان تھیں۔ ان دونوں مذاہب کے درمیان جھگڑا ایک طرف تو اختلاف کی پیداوار تھا خصوصاً اسلام کا تصور بطور ایک طرز حیات کے جو مذہب اور سیاست کو جوڑتا ہے اور ان پر حاوی رہتا ہے بمقابلہ مغربی عیسائیت کا تصور جس میں خدا کی سلطنت اور سیزر کی سلطنت الگ الگ ہیں۔ تاہم جھگڑا ان مذاہب کی مماثلتوں سے بھی پھوٹتا ہے۔ دونوں مذاہب وحدانیت پرست ہیں، دنیا کو ثنویت کے نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں، دونوں ہی آفاقیت پسند ہیں، دونوں مذاہب دعوی دار ہیں کہ ان کا عقیدہ ہی واحد سچا عقیدہ ہے جس سے تمام انسانوں کو وابستہ ہونا چاہیے۔ دونوں تبلیغی (مشنری) مذاہب ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ ان کے ماننے والوں کی ذمہ داری ہے کے لوگوں کو واحد سچے عقیدے کی طرف لائیں۔ اسلام آغاز ہی سے فتوحات کے ذریعے پھیلا اور عیسائیت بھی اکثر ایسا ہی کرتی۔

ہنٹنگٹن اسلام اور عیسائیت کے مابین جھگڑے کی درج ذیل وجوہات بیان کرتا ہے:

اول: مسلم آبادی کی مسلسل بڑھتی ہوئی تعداد نے بیروزگاری اور مایوسی کو جنم دیا جس کی وجہ سے بہت سے لوگ

مغربی ممالک کی طرف نقل مکانی کر گئے۔

دوم: اسلامی احیاء نے مغرب کے مقابلے میں مسلمانوں کو اپنے جداگانہ کردار پر نئے سرے سے اعتماد بخشا اور اپنی تہذیب اور اقدار کی قدر و قیمت سے آشنا کروایا۔

سوم: مغرب کا اپنی اقدار کو آفاقی بنانے کی کوششوں، اپنی فوجی اور معاشی برتری کو برقرار رکھنے اور مسلم دنیا کے جھگڑوں میں مداخلت سے مسلمانوں کے اندر مغرب کے خلاف نفرت کا جذبہ شدت اختیار کر گیا ہے۔

چہارم: کمیونزم کے انہدام نے مغرب اور اسلام کے مشترکہ دشمن کو ختم کر دیا ہے اور دونوں کو ایک دوسرے کے لیے بڑا خطرہ بنا دیا ہے۔ تعامل اور تال میل نے بھی ایک ملک میں بسنے والے دوسری تہذیب سے متعلق لوگوں کے حقوق کے حوالے سے اختلافات کو بڑھا دیا ہے۔

اسلام اور مغرب میں نئے جھگڑے کی بنیاد طاقت اور ثقافت کے مسئلوں پر رکھی ہے۔ کبھی یہ بھی کہا جاتا رہا ہے کہ ان کے درمیان جھگڑے کا ایک بڑا مسئلہ علاقے پر قبضے کا بھی ہے لیکن بعد میں یہ بات واضح ہو گئی کہ سب کی سرحدیں الگ ہیں۔ کہیں بھی کسی کے علاقے پر قبضہ نہیں کیا گیا بلکہ اسلام اور مغرب کے درمیان جھگڑے علاقے کی بنیاد پر نہیں بلکہ بین التہذیبی مسائل کی وجہ سے ہو رہے ہیں مثلاً ہتھیاروں کی روک تھام، انسانی حقوق اور جمہوریت کے مغربی تصورات کا جبری تسلط، تیل پر قبضہ، تارکین وطن، اور مغربی مداخلت وہ بین التہذیبی مسائل ہیں جن کی وجہ سے مغرب اور اسلام کے مابین تصادمات رونما ہو رہے ہیں۔

ایک نمایاں ہندوستانی مسلم کی پیش گوئی جو ہنٹنگٹن نے اپنی کتاب میں شامل کی وہ یہ ہے کہ "مغرب کا اگلا تصادم مسلم دنیا سے یقینی طور پر ہونے والا ہے۔"[۱۶]

ایک تیونسی قانون دان کے مطابق نو آبادیات نے اسلام کی ثقافتی روایات کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ تصادم مذہب کے درمیان نہیں بلکہ دراصل تہذیبوں کے درمیان تصادم ہے۔

مغربی عوام اگر کسی مذہب کے چھا جانے سے خوفزدہ ہیں تو وہ مذہب اسلام ہے۔ اور اپنے اس خوف کو کم کرنے کے لیے مذہب اسلام کے حوالے سے ایسے نظریات بیان کرتے ہیں جو حقیقت سے دور اور سچائی کے منافی ہوتے ہیں۔ جیسے اپنی کتاب میں ہنٹنگٹن اسلام کی سرحدوں کو "خون خوار" سرحدیں کہتے ہیں یعنی مسلمان دنیا کے جس بھی خطے میں ہیں وہاں وہ دوسرے مذاہب کے پیروکاروں سے لڑنا پسند کرتے ہیں۔ جبکہ حقیقت ایسی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ وہ مسلمانوں کو انتہاپسندوں کے روپ میں دیکھتے ہیں۔ جبکہ مذہب اسلام امن وسکون کا درس دیتا ہے۔ اسلام کسی بھی مذہب یا گروہ انسانی کے ساتھ بلاوجہ تصادم کا خواہاں نہیں ہے۔ بقول حذافہ رفیق:

> اسلام محض جغرافیائی، نسلی، لسانی یا رنگ ونسل کو بنیاد بنا کر تمیزِ آدمیت کی مذمت کرتا ہے، اسلام تمام بنی نوع انسان کو کامل مساوات وبرابری کے پیمانے پر رکھ کر حقوق وفرائض عطا کرنے والا دین برحق ہے۔[۱۷]

اس طرح مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ جب کسی دوسری تہذیب میں جاتے ہیں تو مختلف عقائد ونظریات کی وجہ سے بھی ان تہذیبوں کے درمیان تصادم رونما ہوتے ہیں۔

تہذیبی اختلافات کی وجہ جغرافیائی حدود میں فرق:

جغرافیہ (geography) یونانی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی ہیں زمین کا بیان۔ جغرافیہ وہ علم ہے۔ جس میں زمین، اس کی خصوصیات، اس کے باشندوں، اس کے مظاہر اور اس کے نقوش کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ جغرافیہ کو زمین کی سائنس بھی کہا جاتا ہے۔ آج تک انسان نے جتنی بھی ترقی کی ہے۔ وہ جغرافیہ کی ہی مرہون منت ہے۔ زمین انسان کا گھر ہے۔ اور اس گھر سے زیادہ فوائد حاصل کرنے کے لیے علم جغرافیہ انسان کی رہنمائی کرتا ہے۔

ہر ملک کا جغرافیہ مختلف ہوتا ہے۔ طول بلد، عرض بلد کے متعلق معلومات، سطح سمندر سے بلندی، وہاں موجود پہاڑ، میدان، دریا، سمندر، ندی نالے اور جزیرے کیسے اور کس نوعیت کے ہیں۔ یہ سب چیزیں ہر ملک میں الگ ہوتی ہیں۔ مشرق ومغرب میں تہذیبوں کی جداگانہ حیثیت میں یہاں کی آب اور ہوا، وسائل اور ارتقائی سفر کا بہت دخل ہے۔ ان سب چیزوں کے فرق کی وجہ سے بھی تہذیبی اختلافات جنم لیتے ہیں۔ کیونکہ آب وہوا اور دیگر

قدرتی وسائل کے مختلف ہونے سے ہر علاقے کا لباس، وہاں کی خوراک، زندگی گزارنے کے طور اطوار مختلف ہوتے ہیں۔ اس بنا پر بھی تہذیبی اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔

ہر تہذیب خود کو دُنیا کے مرکز کی حیثیت سے دیکھتی ہے اور اپنی تاریخ لکھتے وقت اسے انسانی تاریخ کی مرکزیت کا درجہ دیتی ہے لیکن اس کے باوجود دُنیا کثیر تہذیبی رہی ہے اور تہذیبوں کی شناخت جغرافیہ کے گرد گھومتی رہی ہے، جو نظریہ، فکر، فلسفہ غالب ہوتا ہے تہذیب بھی اُسی کی غالب ہوتی ہے۔

تہذیب خود سے ایک مستقل ارتقائی سفر کا نام ہے اور ایک مخصوص جغرافیہ کا سماج اپنی تہذیبی ترقی کی بنیاد پر ہی معاشی ترقی کی طرف بڑھتا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ

مستنصر حسین تارڑ ایک منفرد ناول نگار، سفر نامہ نگار، افسانہ نگار، ڈرامہ نگار، اور کالم نگار ہیں۔ ان کی تصانیف دنیائے اردو کے اہم تخلیقی نثری اور ادبی سرمائے میں شمار ہوتی ہیں۔ تارڑ کا شمار عصر حاضر کے صفِ اول کے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ آپ ایک ہمہ جہت شخصیت کے حامل ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ یکم مارچ ۱۹۳۹ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ بیڈن روڈ پر واقع لکشمی مینشن میں ان کا بچپن گزرا جہاں سعادت حسن منٹو، معراج خالد، خورشید شاہد پڑوس میں رہتے تھے۔ اب ان کا خاندان ڈی ایچ اے فیز ۲ میں شفٹ ہوگیا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کی شادی ۱۹۷۰ء میں میمونہ بیگم سے ہوئی۔ آپ کی بیگم کو عربی اور فارسی پر مکمل عبور حاصل ہے۔ تارڑ اپنی کتابوں کے مسودے مشورے کے لیے سب سے پہلے اپنی بیگم کو دکھاتے ہیں اور ان کے مشوروں کو بہت اہمیت بھی دیتے ہیں۔

تارڑ کو خالق کائنات نے دو بیٹوں اور ایک بیٹی سے نوازا جو مختلف شعبہ جات میں کام کرتے ہوئے ایک کامیاب زندگی گزار رہے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ نے اپنے والد سے گہرا اثر قبول کیا۔ آپ کے والد پیشے سے کاشتکار تھے اور وہ پڑھنے لکھنے کے بہت شوقین تھے۔ تلاشِ معاش کے سلسلے میں ۱۹۲۸ء میں جب وہ اپنے قصبے سے لاہور

منتقل ہوئے تو وہاں انہوں نے زرعی نوعیت کے جریدے "کاشتکار جدید" کا اجرا کیا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر غفور شاہ قاسم مزید لکھتے ہیں کہ:

> مستنصر حسین تارڑ کے والد نے زراعت سے متعلق کم و بیش پچیس کتابیں لکھیں جو اردو میں علم زراعت کے حوالے سے اولین تصانیف تھیں۔[۱۸]

تعلیم:

مستنصر حسین تارڑ کے والد اپنے کاروبار کے سلسلے میں مختلف شہروں میں رہے۔ اس لیے تارڑ صاحب کا بچپن بھی مختلف شہروں میں گزرا۔ تارڑ نے ابتدائی تعلیم کا آغاز رواج کے مطابق اندرون لاہور کی ایک مسجد "تاج شاہ" سے کیا۔ وہاں انہوں نے قرآن پاک کی تعلیم حاصل کی۔ پرائمری تک کی تعلیم مستنصر نے رنگ محل مشن ہائی سکول لاہور سے مکمل کی۔ پرائمری کے بعد وہ مسلم ماڈل ہائی سکول لاہور میں داخل ہو گئے وہاں سے ۱۹۵۴ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اسی سکول میں سکول کی بزم ادب کے سیکرٹری بھی منتخب ہوئے۔ انٹر میڈیٹ کے لیے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ انٹر کے بعد والد نے ہوزری ٹیکسٹائل میں ڈپلومے کے لیے برطانیہ بھیج دیا۔ مگر برطانیہ میں مستنصر حسین تارڑ نے فلم، تھیٹر اور ادب کو اپنی دلچسپی کا مرکز بنایا اور وہاں ان تمام چیزوں کو ایک نئے زاویے سے دیکھا، سمجھا اور پرکھا۔ بلکہ قیام انگلینڈ کا زیادہ تر حصہ وہاں کی سیر و سیاحت میں گزارا۔ پانچ برس برطانیہ میں گزارے اور اس کے بعد وطن واپس آئے۔

پہلے مجموعے کی اشاعت:

انگلینڈ میں قیام کے دوران ۱۹۵۷ء میں تارڑ کو ماسکو جانے کا موقع میسر آیا۔ ماسکو میں منعقدہ یوتھ فیسٹول میں تارڑ نے برطانوی وفد کے ایک پاکستانی ممبر کی حیثیت سے شرکت کی۔ اسی سفر کی بدولت ان کا پہلا سفر نامہ "لندن سے ماسکو تک" موقر ہفتہ وار جریدے "قندیل" میں ۱۹۵۸ء میں قسط وار شائع ہوا۔ یہ ان کے قلمی سفر کا باقاعدہ آغاز تھا۔

مستنصر حسین تارڑ بطور سفر نامہ نگار:

سفر نامہ ایک بیانیہ صنف ہے جس میں لکھنے والا چشم دید مقامات کے حوالے سے اپنے محسوسات، مشاہدات اور مختلف واقعات کو قارئین کے سامنے تحریری شکل میں پیش کر تا ہے۔ سفر نامہ بہت پرانی روداد نویسی ہے جس میں لکھنے والا کسی اجنبی سرزمین کی سیاحت کے حوالے سے اپنی سرگزشت اپنے انداز سے بیان کر تا ہے۔ یہ سرگزشت تاریخ و جغرافیہ کے علاوہ معاشرت کی بھی کچھ جھلکیاں دکھاتی ہے۔ معروف ادبی مورخ انور سدید نے سفر نامے کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی ہے:

> سفر نامہ سفر کے اثرات، حالات اور کوائف پر مشتمل ہو تا ہے۔ فنی طور پر سفر نامہ وہ بیانیہ ہے جو سفر نامہ نگار سفر کے دوران یا اختتام سفر پر اپنے مشاہدات، کیفیات اور اکثر قلبی واردات سے مرتب کرتا ہے۔[۱۹]

اردو سفر ناموں میں یوسف خان کمبل پوش کے سفر نامے عجائباتِ فرنگ کو اولیت حاصل ہے۔ وہ طبعاً ایک سیاح تھے۔ یوسف خان کمبل پوش کا اسلوبِ تحریر انیسویں صدی کی نثر کا عمدہ نمونہ ہے۔ سفر نامے میں درج واقعات اور ذاتی تاثرات کی وجہ سے داستان اور افسانے کا سا لطف پیدا ہو گیا ہے۔

جب تارڑ یورپی ممالک کی سیاحت پر روانہ ہوئے، واپسی پر نکلے تری تلاش میں کے نام سے سفر نامہ لکھا۔ یہ ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا۔ قارئین اور ناقدین دونوں نے اسے بہت پسند کیا۔ اِس کتاب کو ملنے والی پزیرائی کے بعد انھوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اگلا سفر نامہ اندلس میں اجنبی تھا۔ پاکستان کے شمالی علاقہ جات کے سفر بھی کیے اور وہاں کی سفری روداد کو بھی دلچسپ انداز میں قارئین کے سامنے پیش کیا۔ پاکستان کی بلند ترین چوٹی "کے ٹو" پر ان کا سفر نامہ اس قدر مقبول ہوا کہ دو ہفتے میں پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا۔ اِس علاقے سے اُن کے گہرے تعلق کی بنا پر وہاں کی ایک جھیل کو "تارڑ جھیل" کا نام دیا گیا۔ ان کے چند نمایاں سفر ناموں کے نام یہ ہیں:

نکلے تری تلاش میں، اندلس میں اجنبی، خانہ بدوش، نانگا پربت، نیپال نگری، سفر شمال کے، سنو لیک، کالاش، پتلی پیکنگ کی، شمشال بے مثال، سنہری اُلو کا شہر، کیلاش داستان، ماسکو کی سفید راتیں، یاک سرائے، نیو یارک کے سو رنگ، ہیلو ہالینڈ، الاسکا ہائی وے، لاہور سے یار قند، امریکا کے سو رنگ، آسٹریلیا آوارگی، راکاپوشی نگر، اور سندھ بہتا رہا، غارِ حرا میں ایک رات، منہ ول کعبہ شریف وغیرہ ان کے چند مشہور سفر نامے ہیں۔

تارڑ نے اردو ادب میں سفر نامہ لکھنے کا ایک ایسا انداز متعارف کروایا جس نے نہ صرف سفر نامہ کے قارئین کی تعداد میں اضافہ کیا بلکہ نئے لکھنے والوں کو بھی تحریک دی۔

مستنصر حسین تارڑ کی سفر نامہ نگاری پر محمود نظامی اور شفیق الرحمٰن کے گہرے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا پہلا سفر نامہ نکلے تری تلاش میں عہدِ جدید کی سفر نامہ نگاری کا آغاز ہے۔ ان کے اس سفر نامے کے حوالے سے ڈاکٹر سید عبد اللہ لکھتے ہیں:

> یوں تو اردو میں بہت اچھی اچھی کتابیں نکل رہی ہیں مگر معرکے کی کتاب کبھی کبھی تخلیق ہوتی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کی کتاب نکلے تری تلاش میں ایسی ہی ایک کتاب ہے جس کا اثر دل میں مدتوں موجود رہتا ہے۔ یوں تو یہ ایک سفر نامہ ہے مگر اسے عمدہ خود نوشت بھی کہا جا سکتا ہے۔ [۲۰]

تارڑ اپنے سفر ناموں میں مقامات سے زیادہ محسوسات اور مشاہدات کو اہمیت دیتے ہیں۔ تارڑ کے نزدیک سیاحت ایک دیوانگی ہے، ایک آوارگی ہے جس سے ان کی روح سراب ہوتی ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کی سفر نامہ نگاری کے حوالے سے مبین مرزا لکھتے ہیں:

> مستنصر حسین تارڑ اس عہد کے جانے پہچانے ادیب ہیں۔۔۔۔ سفر نامہ نگاری میں دیکھا جائے تو کمیت، کیفیت اور تنوع کے لحاظ سے وہ ایک الگ ہی شناخت رکھتے ہیں۔ اردو سفر نامے کی تاریخ میں یہ شناخت تادیر قائم رہنے والی ہے۔ [۲۱]

تارڑ کی وجہ سے اردو ادب کی یہ نوخیز صنفِ نثر اردو کی مقبول ترین اصنافِ ادب افسانہ اور ناول سے شانہ ملاتی دکھائی دیتی ہے۔ تارڑ کے سفر ناموں میں داستان کی سی طرازی، فکشن جیسی فسانہ سازی، ڈراما کی سی منظر کشی، آپ بیتی سا لطف اور جگ بیتی کی سی لذت محسوس ہوتی ہے۔ تارڑ کی سفر نامہ نگاری کے اہم عناصر کے حوالے سے غفور شاہ قاسم لکھتے ہیں کہ:

> تحیر، تفکر، کہانی پن، افسانویت، طنز و مزاح، ڈرامائیت، بے ساختگی، شوخی و شرارت، سوچ کی تازگی، مشاہدے کی گہرائی، انسان دوستی کا شعور اور ادبی اسلوب تارڑ کی سفر نامہ نگاری کے اہم عناصر ہیں۔ [۲۲]

دیگر تخلیقی جہات:

مستنصر حسین تارڑ ایک ہمہ جہت قلم کار ہیں۔ ان کی دلچسپی کی خصوصی میدان سفر نامہ اور فکشن (ناول / افسانہ) ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ کے تخلیقی سفر کا آغاز بے شک ان کی سفر نامہ نگاری ہے۔ سفر نامے کو جدت عطا کر دینے کے بعد تارڑ نے ناول نگاری کی طرف قدم بڑھائے اور ایک ناول نگار کی حیثیت سے بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ انہوں نے پیار کا پہلا شہر، بہاؤ، راکھ، خس و خاشاک زمانے اور اے غزال شب جیسے شہرہ آفاق ناول تخلیق کیے۔

پیار کا پہلا شہر بطور ناول نگار ان کا پہلا ناول ہے۔ جس کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی اور اب تک اس ناول کے پچاس سے زائد ایڈیشن آ چکے ہیں۔ اس ناول اور آخری ناول اے غزالِ شب کے درمیان جتنے ناول منظرِ عام پر آئے ان میں راکھ جیسا ناول بھی شامل ہے جسے جنوبی ایشیا کی تاریخ پر لکھا جانے والا بہترین ناول سمجھا جاتا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کے ادبی سفر کے حوالے سے نجم الدین احمد کا کہنا ہے:

> مستنصر حسین تارڑ کے ادبی سفر کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلی منزل میں وہ بطور سفر نامہ نگار نظر آتے ہیں، دوسری میں ڈرامہ نگار اور آخری منزل ناول نگاری کی سامنے آتی ہے۔
> [۲۳]

اس کے علاوہ مستنصر حسین تارڑ نے کچھ عرصہ ٹی وی ڈراموں میں اداکاری کے بھی جوہر دکھائے۔ تقریباً چار سو ڈراموں میں کام کیا اور بطور ایک سپر سٹار کافی مقبول ہوئے۔ شادی کے بعد تارڑ نے اداکاری چھوڑ دی اور ٹی وی

کی نشریات کا آغاز کیا تو بطور میزبان تارڑ کا انتخاب کیا گیا۔ صبح کی نشریات کے توسط ہی سے تارڑ بچوں کے پسندیدہ "چاچا جی" کی صورت میں سامنے آئے اور یوں وہ ہر گھر کا فرد بن گئے۔

TH-23957

تارڑ کی ایک اور تخلیقی جہت کالم نگاری بھی ہے۔ تارڑ نے تقریباً آٹھ برس تک "مشرق" اخبار میں کالم نگاری کی۔ بعد ازاں وہ "جناح اخبار" اور "اخبارِ جہاں" میں بھی کالم لکھتے رہے۔ انگریزی اخبار "ڈان" کے لیے بھی ایک عرصے تک کالم نگاری کرتے رہے۔

مستنصر حسین تارڑ کے کالموں میں مزاح کا عنصر بھی پایا جاتا ہے اور تجسس بھی کہ اکثر وہ اپنے کالم کی ابتداء ہی سے قاری کے لیے تجسس کی ایسی فضا قائم کر لیتے جو قاری کو جکڑے رکھتی ہے۔ اور یہ تجسس وہ اپنے مخصوص کرداروں اور عجیب و غریب الفاظ و تراکیب سے پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً موقع پرست لوگوں کے لیے وہ "چک چک" کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید نے تارڑ کی کالم نگاری پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

> تارڑ نے بیسویں صدی کی آخری دو دہائیوں میں افسانہ اور انشائیہ نما کالم لکھے۔ یہ کالم روزنامہ مشرق، لاہو میں کارواں سرائے کے عنوان سے شائع ہوئے۔ تارڑ کی طنز تیکھی اور تلخ ہے۔ [۲۴]

مستنصر حسین تارڑ اپنے کالموں میں دھیمے لہجے میں طنز کا گہرا وار کرنے میں خاصی مہارت رکھتے ہیں۔ انہوں نے سادہ اسلوب تحریر اپنا کر اپنے کالموں کو عام آدمی کے لیے بھی قابلِ مطالعہ بنا دیا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ نثر کو شاعری پر ترجیح دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ نثر میں دوٹوک ردِ عمل ظاہر کرنا پڑتا ہے۔ ان کی نظر میں شاعری ایک دل فریب دھوکا ہے۔ حسن رضوی کو دیئے گئے ایک انٹرویو میں مستنصر حسین تارڑ شاعری کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> شاعری ایک دھوکا ہے، اس میں خوبصورت جھوٹ اور دل آویز فریب ہوتے ہیں، ایک خیالی دنیا ہوتی ہے جس میں ایک پتہ جنگل ہوتا ہے۔۔۔ [۲۵]

اعزازات و امتیازات:

مستنصر حسین تارڑ کو ان کے کام کی وجہ سے مختلف سطحوں پر بہت سے اعزازات و امتیازات سے نوازا گیا۔

جیسے

۱۹۹۲ء میں انہیں صدارتی تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا گیا۔
۱۹۹۸ء میں ان کے ناول راکھ کی بدولت وزیر اعظم ادبی ایوارڈ بطور ناول نگار دیا گیا۔
صدر پاکستان کے ہاتھوں اکادمی ادبیات پاکستان کا ہجرۃ ایوارڈ سے نوازا گیا۔
مجلس فروغِ اردو ادب دوحہ (قطر) کی طرف سے سلیم جعفری انٹرنیشنل ایوارڈ ۲۰۰۳ء میں دیا گیا۔

اس طرح مستنصر حسین تارڑ کے کام کو مختلف سطحوں پر خوب سراہا گیا۔ ان کی تحریروں کو مختلف ملکی و غیر ملکی کالجز اور جامعات کے نصاب میں بھی شامل کیا گیا۔ ماہنامہ "کاغذی پیراہن" لاہور کے سروے کے مطابق مستنصر حسین تارڑ بیسویں صدی کے بہترین سفر نامہ نگار قرار دیئے گئے۔ اس سروے کے مطابق بہترین تخلیق کاروں میں آپ کو وزیر آغا کے بعد سب سے زیادہ ووٹ ملے۔

حوالہ جات

۱۔ ہینری سیسل وائلڈ (Henry Cecil Wyld)، *The universal English Dictionary*۔ (لندن: روٹلیج، ۱۹۵۶ء)، ص ۱۸۸۔

۲۔ بارن ہارٹ، کلارنس، رابرٹ (مرتبین)، (Barnhart, Clarence L., Robert K.) *The World book Dictionary*۔ جلد اول (شکاگو: سکاٹ فیسٹرز کمپنی، ۱۹۸۳ء)، ص ۳۷۷۔

۳۔ سیموئیل فلپس ہنٹنگٹن (Samuel p. Huntington)، *The Clash of Civilizations and the Remaking of world order* (نیویارک: سائمن اینڈ چیسٹر پبلشرز، ۲۰۰۳ء) ص ۴۰۔

۴۔ ایضاً، ص ۴۱۔

۵۔ سید سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقا (کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۸۹ء)، ص ۱۳۔

۶۔ جازب قریشی، شاعری اور تہذیب (کراچی: مکتبہ کامران، ۱۹۸۸ء)، ص ۷۔

۷۔ سید سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقا، ص ۱۱۔

۸۔ سیموئیل فلپس ہنٹنگٹن (Samuel P. Huntington)، The clash of Civilizations مشمولہ فارن افئیرز سمر (۱۹۹۳ء)، ص ۱۶۔

۹۔ سیموئیل فلپس ہنٹنگٹن، تہذیبوں کا تصادم، مترجم محمد احسن بٹ (مثال پبلشنگ ہاؤس: ۲۰۰۳ء)، ص ۳۵۔

۱۰۔ حذافہ رفیق، عصری تہذیبی تصادم اور فکرِ اقبال کا تجزیاتی مطالعہ، پی ایچ ڈی علوم اسلامیہ (لاہور: جامعہ پنجاب، ۲۰۱۰ء)، ص ۵۔

۱۱۔

سہیل

انجم (اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء) ص ۴۸۰۔

۱۲۔ سیموئیل پی۔ ہنٹنگٹن، تہذیبوں کا تصادم مترجم احسن بٹ (لاہور: مثال پبلشنگ، ۲۰۰۳ء)،

ص۲۳۶۔

۱۳۔ ایضاً، ص۲۶۱۔

۱۴۔ ایضاً، ص۲۳۶۔۲۳۷۔

۱۵۔ ایضاً، ص۲۴۷۔

۱۶۔ ایضاً، ص۲۷۹۔

۱۷۔ حذافہ رفیق، عصری تہذیبی تصادم اور فکر اقبال کا تجزیاتی مطالعہ، پی ایچ ڈی علوم اسلامیہ (لاہور: جامعہ پنجاب ۲۰۱۰ء)، ص۴۔

۱۸۔ غفور شاہ قاسم، مستنصر حسین تارڑ : شخصیت اور فن (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان ۲۰۱۸ء)، ص۱۳۔

۱۹۔ انور سدید، اردو ادب میں سفر نامہ (لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، س۔ن)، ص۵۲۔

۲۰۔ سید ضمیر جعفری (بانی و مدیر)، چہار سو، مستنصر حسین تارڑ نمبر، راولپنڈی (شمارہ، مارچ اپریل ۲۰۱۵ء) ص۴۷۔

۲۱۔ غفور شاہ قاسم، مستنصر حسین تارڑ: شخصیت اور فن، ص۲۳۱۔

۲۲۔ ایضاً، ص۳۲۔

۲۳۔ ایضاً، ص۲۳۲۔

۲۴۔ ڈاکٹر انور سدید، اردو ادب کی مختصر تاریخ (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۱ء)، ص۵۹۲۔

۲۵۔ حسن رضوی، گفت و شنید (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز ۱۹۹۰ء)، ص۲۶۶۔

باب دوم:

سفر نامے میں تہذیبی، ثقافتی اور جغرافیائی اختلافات کا تجزیاتی مطالعہ

باب دوم:

سفر نامے میں تہذیبی، ثقافتی اور جغرافیائی اختلافات کا تجزیاتی مطالعہ

سفر نامہ نیو یارک کے سو رنگ:

مستنصر حسین تارڑ کا سفر نامہ نیو یارک کے سو رنگ ۲۰۰۸ء میں سنگِ میل پبلی کیشنز سے شائع ہوا۔ یہ ان کے اس سفر کی روداد ہے جو انہوں نے اپنے بیٹے سلجوق اور بیٹی قرۃ العین سے ملنے کے لیے اختیار کیا۔ اس سفر نامے میں انہوں نے امریکہ کے شہر نیو یارک کو ایک عام انسان کی طرح سر سری نظر سے نہیں دیکھا بلکہ ایک ادیب کی طرح اس شہر کو مختلف انداز سے دیکھا۔ وہاں موجود مختلف چیزوں اور لوگوں کا بغور مشاہدہ کیا اور اپنے تاثرات کو منفرد اور انوکھے انداز میں قلمبند کیا۔ سفر کی روداد لکھتے ہوئے ایک ایسا انداز اختیار کیا کہ جس میں پڑھنے والے کو یوں محسوس ہوتا ہے گویا ایک افسانہ نگار اور ایک سیاح کے ساتھ وہ خود بھی اس سفر میں ان کا ساتھی ہے۔ اس سفر نامے کی فضا میں حیرت بھی ہے اور تجسس بھی۔ منظر نگاری کے بیان میں تارڑ نے جزئیات نگاری کا استعمال اس انداز میں کیا ہے کہ پڑھنے والے کو یوں محسوس ہوتا ہے گویا وہ بھی اس منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ تارڑ کی تحریر میں بے ساختگی، روانی، موزوں ترین الفاظ کا استعمال اور ربط ملتا ہے۔

سفر نامہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ گہرائی سے مشاہدہ کرنے کی اہلیت رکھتا ہو، تاکہ مختلف تہذیبوں کو وہ بہتر انداز میں بیان کر سکے۔ مستنصر حسین تارڑ کے سفر ناموں میں ان کی یہ صلاحیت اُبھر کر سامنے آتی ہے۔ مثلاً جب میٹرو پالیٹن میوزیم آف آرٹ کو دیکھنے جانے کا احوال بیان کرتے ہیں تو وہاں موجود نوادرات کے ساتھ ساتھ ان نوادرات کو دیکھنے والوں کے انداز کو بھی غائر نگاہ سے دیکھتے ہوئے اس مشاہدے کو اپنے سفر نامے کا حصہ بناتے ہیں۔

مصنف نے نیو یارک کی تہذیب و ثقافت کو بہت قریب سے دیکھا اور اسے اپنے سفر نامے کا حصہ بنایا۔ اس حوالے سے غفور شاہ قاسم لکھتے ہیں کہ:

امریکی معاشرت، معیشت، تہذیب وتمدن، کلچر اور ثقافت کو سمجھنے کے لیے اس سے بہتر شاید ہی کوئی کتاب اردو زبان میں موجود ہو۔[1]

اپنے اس سفر نامے میں مصنف نے صرف نیویارک کی عمارات، وہاں کے مجسمے اور مختلف سیاحتی مقامات کے حوالے سے ہی نہیں لکھا بلکہ ان تمام چیزوں کے ساتھ ساتھ وہاں کی معاشرت، تہذیب و تمدن، ثقافت اور معیشت وغیرہ کو بھی اپنے سفر نامے کا حصہ بنایا ہے۔ اور ان تمام چیزوں کو ایک مختلف انداز میں بیان کیا اور کہیں کہیں تقابلی انداز اختیار کرتے ہوئے اپنی تحریر کو مزید دلچسپ بنادیا ہے۔

مصنف کے بقول روسی ادیب میکسم گورکی نے نیویارک شہر کو "زرد شیطان کا شہر City of Yellow Devil)" کہاہے۔ گورکی کے مطابق یہ زرد شیطان کا شہر ہے۔ یہ شہر شیطان کا مندر ہے اور یہاں کے باشندے اس کے اندھے پجاری ہیں۔ وہ دراصل یہاں کے سرمایہ دارانہ نظام کی مخالفت میں تھا۔ اس شہر کے حوالے سے گورکی کے چند جملوں کو مصنف نے اپنے سفر نامے کا حصہ بنایا ہے:

> دور سے یہ شہر ایک دیوزاد جبڑا لگتا ہے جس کے غیر ہموار دانت دکھائی دیتے ہیں۔ یہ دھوئیں کے سیاہ بادل آسمان میں اُگلتا ہے اور ایک پیٹو شخص کی مانند ہانپتا ہے۔ تم شہر میں داخل ہوتے ہو تو گویا پتھر اور لوہے کے شکم میں چلے گئے ہو۔۔۔ ایک ایسا شکم جس نے لاکھوں انسانوں کو نگل لیا ہے اور اب چبا چبا کر انہیں ہضم کر رہا ہے۔۔۔۔۔ یہ ایک حیرت انگیز ملک ہے۔۔۔ اور یہ ایک حیرت انگیز شہر ہے۔۔نیویارک۔۔۔امریکہ ایک ایسا ملک ہے کہ انسان خواہش کرتا ہے کہ اس کے چار سر ہوں۔۔۔بتیس ہاتھ ہوں تاکہ وہ مزید محنت کرے۔۔۔ کام کرے۔۔۔۔ کام، کام اور کام۔۔۔۔[2]

مستنصر حسین تارڑ نے نیویارک کو اپنے نقطہ نظر، منفرد زاویے سے دیکھا اور ان کا تاثر گورکی کے تاثر سے بالکل مختلف تھا۔ وہ اس شہر کے حسن و جمال سے بے حد متاثر ہوئے۔ اور اس کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> میری آنکھ گورکی کی آنکھ سے جدا تھی، چنانچہ میں نے جو نیویارک دیکھا اس میں بے شک سرمایہ داری نظام کی بھگدڑ اور چکاچوند تھی لیکن اس کی دل فریبی اور کشش کی بھی کوئی مثال نہ تھی۔۔۔۔۔۔[3]

مصنف نے اس شہر کی چکا چوند اور ہنگامی زندگی کو بھی اپنی تحریر کا موضوع بنایا اور اس کے ساتھ ساتھ وہاں کی خوبصورتی کو بھی محسوس کیا۔

زندگی میں کسی بھی موقع پر اختلافات تب جنم لیتے ہیں جب دو چیزوں کے درمیان موجود فرق کو قبول کرنے کی بجائے ان چیزوں کے درمیان تقابل کی فضا بنائی جائے، یا جب ایک چیز کی بڑائی ثابت کرتے ہوئے اسے زبردستی دوسروں پر مسلط کیا جائے اور دوسری چیز کو اس کی کمتری کا احساس دلایا جائے، ایسی صورتحال سے شدید نوعیت کے اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔

تہذیبوں کے درمیان اختلافات بھی اسی صورت پیدا ہوتے ہیں جب ایک تہذیب اپنی برتری زبردستی مسلط کرتے ہوئے دوسری تہذیب کی انفرادیت و اہمیت سے انکاری ہو جائے۔

سیموئیل پی ہنٹنگٹن کی پیش کردہ تھیوری " تہذیبوں کا تصادم " کے حوالے سے دیکھا جائے تو مختلف تہذیبوں کے درمیان تصادم رونما ہونے کی بہت سی وجوہات ہیں۔ جیسے مختلف تہذیبوں کی الگ ثقافتوں اور ان کی انفرادی اہمیت کو جب تسلیم نہ کیا جائے اور ان پر زبردستی تسلط جمانے کی کوشش کی جائے تب تہذیبی تصادم رونما ہوتا ہے۔ اسی طرح جغرافیائی حدود کے مختلف ہونے کی وجہ سے کھانا پینا، رہن سہن، لباس، عادات و اطوار، رسم و رواج کے مختلف ہونے سے بھی یہ تصادم جنم لیتے ہیں۔

ہنٹنگٹن کا ماننا ہے کہ مستقبل میں جنگیں ممالک کے درمیان نہیں بلکہ تہذیبوں کے درمیان لڑی جائیں گی۔ ان کے مطابق تہذیبوں کے اختلاف سے پوری دنیا میں تضاد پیدا ہو جائے گا۔ انہوں نے اس تصور کو بھی رد کیا ہے کہ تمام اقدار آفاقی (یونیورسل) ہیں یا ان اقدار کو آفاقی بنایا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سیموئیل نے انفرادی اور ریاستی شناخت کی تشکیل میں مذہب اور کلچر کے بارے میں بھی پیش گوئی کی ہے۔ ان کے مطابق تہذیبوں کے درمیان تصادم عالمی امن کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ اس میں وہ اسلامی تہذیب اور چینی تہذیب کو سب سے بڑا خطرہ سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ دنیا پر مغربی تسلط کے درمیان سب سے بڑی رکاوٹ اسلام ہو گا۔

مغرب کا یہ کہنا ہے کہ غیر مغربی لوگوں کو مغرب کی جمہوریت، محدود حکومت، انسانی حقوق، انفرادیت پسندی اور قانون کی حکمرانی جیسی اقدار سے وابستہ ہونا چاہیے اور اپنے اداروں میں بھی ان اقدار کو نافذ کرنا چاہیے۔

کچھ تہذیبوں میں اقلیتیں ان اقدار کو نہ صرف تسلیم کرتی ہیں بلکہ انہیں فروغ بھی دیتی ہیں لیکن ان اقدار کے حوالے سے غیر مغربی ثقافتوں کے اندر غالب رجحان تشکیک پسندی کا ہے جو وسیع اختلاف تک جا پہنچتا ہے۔

مغرب کے اس طرح ہر طرف چھا جانے والے رویے کے متعلق ہنٹنگٹن کا کہنا ہے کہ: "مغرب کے لیے

جو آفاقیت ہے وہ باقی دنیا کے لیے استعماریت، سامراجیت ہے۔"[۴]

نو آبادیاتی عہد برصغیر کی تاریخ کا ایک ایسا باب ہے جس میں انگریزوں نے ایک پوری تہذیب پر زبردستی قبضہ کیا، وہاں ہر لحاظ سے اپنی برتری ثابت کرنے کی کوشش کی۔ برصغیر میں رہنے والوں کو غیر متمدن اور غیر تہذیب یافتہ قرار دے کر ان کو احساسِ کمتری میں مبتلا کیا پھر ان پر زبردستی اپنی تہذیب و ثقافت کو مسلط کیا گیا۔ موجودہ دور کے تہذیبی تصادم کو نو آبادیات کی ہی ایک نظریاتی صورت کہا جا سکتا ہے۔ نو آبادیاتی عہد میں بھی مغربی تہذیب دوسری تہذیب پر اثر انداز ہو رہی تھی اور اس کی یہی کوشش تھی کہ تمام دنیا میں اس کی تہذیب و ثقافت پھیلائی جائے۔ نو آبادیات میں کسی علاقے پر قبضہ کر کے وہاں پر زبردستی اپنا اثر قائم کیا جاتا تھا۔ مقبوضہ علاقے کے لوگوں کو احساسِ کمتری میں مبتلا کر کے ان کی تہذیب و ثقافت کو کمتر کہا جاتا تھا اور اب بھی مغرب کے اس آفاقی تہذیب کے تصور میں یہی چیز شامل ہے کہ باقی دنیا کی تہذیب و ثقافت کو ختم کر کے عالمگیر تہذیب کے نام پر مغربی تہذیب کو رائج کیا جائے۔

دو معاشروں، قوموں اور ممالک کے درمیان سیاسی، اقتصادی، سماجی اور ذہنی لین دین کی بنیاد عدم مساوات، ایک طاقتور کا دوسرے کمزور فریق کے استحصال اور غلبے پر رکھی جاتی ہے۔ جس میں تمام تر فیصلے حاکم تنظیم کے اختیار میں ہوتے ہیں۔ درحقیقت نو آبادیاتی تمدن کے مغلوب معاشرے میں منتقلی کا مقصد مقامی لوگوں کی ثقافت کا استحصال کرنا ہوتا ہے۔

مغرب کے اس رویے کے حوالے سے طاہر کامران کا کہنا ہے:

> ہندوستان کی معاشی اقدار کو توہم پرستی، تلذذ اور غیر انسانی رسوم سے عبارت قرار دے کر مسترد کر دیا گیا اور اس خیال کو رواج دینے کی حتی المقدور کوشش کی گئی کہ مشرق کی غیر متمدن عوام کو تہذیب و تمدن سے آشنا کرنے کی ذمہ داری انگریزوں کو خدا نے سونپی ہے۔[۵]

موجودہ دور میں گلوبلائزیشن کے ٹھیکیداروں کی یہ کوشش رہی ہے اور مستقبل میں بھی یہی رہے گی کہ ہر قوم کی تہذیب و ثقافت اور اس کے تمدن کو ختم کر دیا جائے اور پوری دنیا میں ایک ہی طرح کی تہذیب رائج کر دی جائے جو مغربی بلکہ امریکی اقدار پر مبنی ہو، تاکہ دنیا اس تہذیب کو اپنا کر اس طرز پر زندگی گزارے کہ مغربی مفادات کی راہ میں کوئی رکاوٹ حائل نہ ہو اور نام نہاد عالمگیریت اپنے تمام مقاصد کامیابی سے حاصل کر لے۔ اس لیے کہ جب سطح زمین پر پائی جانے والی تمام اقوام آفاقی تہذیب یعنی مغربی تہذیب یا امریکی تہذیب و ثقافت کو اپنا لیں گی تو انہیں امریکا کی سیاسی واقتصادی پالیسیوں کو اپنانے پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

کسی بھی قوم کا تہذیبی ورثہ اس کی زبان، تاریخ، مہارت ولیاقت، فنی، ادبی اور علمی صلاحیتیں، رسوم ورواج اور اس کے اقدار ہوتے ہیں۔ جس طرح یہ تمام چیزیں ایک تمدن کا حصہ ہیں۔ اسی طرح اس قوم کا لباس، کھانے پینے کی اشیا، اسلوبِ عمل، محبت و مسرت، خوشی و غمی کا انداز اور اس کے احساسات و جذبات بھی ثقافت میں شامل ہیں۔ اگر ہم کسی بھی قوم سے یہ مطالبہ کریں کہ وہ اپنی مذکورہ صفات سے کنارہ کش ہو جائے، اپنے اندازِ فکر اور احساسات و نظریات سے عہدہ برآ ہو جائے اور اپنی زبان ولباس کو تبدیل کر دے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ ہم اس قوم کی ثقافت سلب کر رہے ہیں اور ان کے تمدن کو چھین کر دوسری تہذیب ان پر مسلط کر رہے ہیں۔

اس طرح جب ایک تہذیب دوسری تہذیب اور ثقافت کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کی بجائے ان پر زبردستی اپنا تسلط قائم کرنے کی کوشش کرنے لگے تب ان تہذیبوں اور ثقافتوں کے مابین جو اختلافات پیدا ہوتے ہیں وہ تہذیبی تصادم کی وجہ بنتے ہیں۔

سفرنامہ نیو یارک کے سو رنگ میں مصنف مستنصر حسین تارڑ نے امریکی تہذیب اور پاکستانی تہذیب کے درمیان موجود فرق کا جائزہ لیا اور انہیں سفرنامے میں بیان کیا ہے۔ کسی بھی ملک کا سفرنامہ محض سفری کہانی ہی نہیں ہوتی بلکہ اس ملک کی تہذیب اور کلچر کی عکاسی کرتا ہے۔ ہم کسی بھی ملک کی روایات ، رسم ورواج اور ثقافتی رویوں کے مطالعہ کے لیے اس ملک کے حوالے سے لکھے گئے سفرناموں کا ہی انتخاب کرتے ہیں۔ اور معلومات اکٹھی کرتے ہیں۔ اس ملک کی تہذیب وثقافت، روایات اور رسم ورواج کو سفرنامے کے ذریعے ہی جانتے ہیں۔

مصنف نیویارک جیسے شہر میں جاکر جب وہاں کی عمارات، وہاں کی مختلف چیزوں کا تذکرہ کرتے ہیں تو اس تذکرے میں کہیں کہیں تیسری دنیا کے فرد کا احساسِ محرومی اور کمتری بھی نظر آتا ہے۔ مثلاً مصنف جب نیویارک شہر میں موجود مختلف لائبریریوں اور میوزیمز کو دیکھتے ہیں تو ان کے اندر یہ احساس محرومی شدت کے ساتھ جنم لیتا ہے کہ ہم کیوں اپنی تاریخ اور تہذیب و ثقافت کو بھول بیٹھے ہیں۔ ہم نے اس طرح اپنی تاریخ اور تہذیب کو اس انداز میں محفوظ کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔

تہذیب سے مراد بنی نوع انسان کا زندگی گزارنے کا طریقہ کار ہے۔ تہذیب کسی بھی معاشرے میں انفرادی طور پر نہیں بلکہ اجتماعی طور پر پروان چڑھتی ہے اس لیے یہ ہماری زندگی کی ایک اہم اکائی ہے۔ زندگی گزارتے ہوئے انسان اپنی روایات کے ساتھ جیتا ہے۔ ایک تہذیب کا دوسری تہذیبوں سے بھی واسطہ رہتا ہے اور ہمیشہ انسانی زندگی پر اس واسطے کے اثرات مرتب ہوتے رہتے ہیں۔ تہذیب ہمیشہ مخصوص ہوتی ہے کیونکہ سماج کی تبدیلی سے تہذیب بھی نئے رنگوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ ایک مخصوص سماج کی اپنی مخصوص تہذیب ہوتی ہے۔

جب ادب کسی سرزمین کے تہذیبی منظر نامے کو پیش کرتا ہے تو بعض اوقات تہذیبوں کے اختلافات ادب کا اہم موضوع بن جاتے ہیں۔ مابعد نو آبادیاتی عہد کا ادب جو تیسری دنیا میں تخلیق ہو رہا ہے اس میں تہذیبوں کے اختلافات پر مشتمل بیانیہ ملتا ہے۔ سفر نامے کا شمار ادب کی بیانیہ اصناف میں ہوتا ہے۔ اس صنف میں مشاہدے کا عمل دخل زیادہ اور تخلیقی عنصر کم ہے۔ سفر نامہ چونکہ چشم دید واقعات و حالات کا بیانیہ ہے اس لیے سفر اس کی بنیادی شرط ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کے سفر ناموں میں ہمیں مشاہدہ اور تخلیقی عمل دونوں نظر آتے ہیں۔ جب وہ اپنے سفر ناموں میں دو تہذیبوں کے مناظر بیان کرتے ہیں تو اس لمحے تیسری دنیا کے باسی کی محرومیاں اور ناکامیاں بھی اس میں شامل ہونے لگتی ہیں۔ کہیں کہیں ان کے سفر ناموں میں افسانویت سی ابھرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ان کے سفر ناموں کے مطالعے سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سفر نامے زندگی کا مسلسل اور متحرک بیانیہ ہیں۔

ثقافت عربی زبان کا لفظ ہے جس سے مراد کسی قوم یا طبقے کی تہذیب ہے۔ ثقافت عربی لفظ "ثقف" سے نکلا ہے جس کے معانی عقلمندی اور مہارت کے ہیں۔ انگریزی زبان میں اس کے لیے Culture کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

فیض احمد فیض اپنی کتاب ہماری قومی ثقافت میں کلچر کی تعریف یوں کرتے ہیں:

کلچر کا لفظ عام طور پر محض فنونِ لطیفہ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ یعنی وہ خاص قسم کی جمالیاتی تخلیقات جو کہ کوئی معاشرہ پیدا کرتا ہے۔ اس میں مصوری، شاعری اور فنِ تعمیر ہے۔۔۔۔۔[۵]

ثقافت کو اکتسابی، ارادی یا شعوری طرزِ عمل کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ اکتسابی طرزِ عمل میں ہماری وہ تمام عادات، افعال، خیالات اور رسوم و اقدار شامل ہیں جن کو ہم ایک منظم معاشرے یا خاندان کے رکن کی حیثیت سے عزیز رکھتے ہیں اور ان پر عمل کرتے ہیں یا عمل کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔

ثقافت کا تعلق انسان کے شعوری پہلو سے بھی ہے جس میں علم، عقائد، اخلاقی قوانین، رسوم و رروا ج اور جمالیاتی اقدار شامل ہیں۔ ان میں مذہب، آرٹ، ادب، رسم و رواج اور اخلاقیات وغیرہ میں فرق کی وجہ سے تہذیبی اختلافات جنم لیتے ہیں۔ اور پھر جب ایک تیسری دنیا کا باسی امریکہ جیسے ملک میں جاتا ہے تو وہ ہر بڑی سے بڑی چیز سے لے کر چھوٹی سے چھوٹی چیز کا مقابلہ شروع کر دیتا ہے اور یہ مقابلہ تصادم کی صورت اس وقت اختیار کرتا ہے جب محرومیوں اور ناکامیوں کا احساس شدت اختیار کرتا ہے۔ اور جب دوسری تہذیب اپنا آپ زبردستی مسلط کرنے کی کوشش کرتی ہے تو تسلط کی اس کوشش سے بھی تہذیبی تصادمات پیدا ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ اور جب مقابلے کی فضا میں اپنی چیز کم تر لگنے لگے تب بھی صورت حال خطرناک ہو جاتی ہے۔ مثلاً جب مصنف نے اپنا سفر شروع کیا تو ساتھ ہی تقابل بھی شروع ہو گیا اور یہ تقابل شعوری طور پر نہیں بلکہ غیر شعوری طور پر شروع ہو جاتا ہے۔ جیسے غیر ملکی ائیر لائنز اور ملکی ائیر لائن پی آئی اے کے سفر اور اس سفر میں ملنے والی سہولیات کا تقابل کچھ اس انداز میں کرتے ہیں:

> غیر ملکی ائیر لائنز میں سفر کرنے کے بے شمار فوائد ہیں۔ ٹکٹ نسبتاً کم قیمت پر مل جاتے ہیں۔ صفائی ستھرائی بھی بڑھیا ہوتی ہے۔ اور آس پاس نہایت "تہذیب یافتہ" اقوام کے لوگ براجمان ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ جبکہ پی آئی اے کے کرائے گراں ہیں، سروس میں بے اعتنائی ہوتی ہے۔۔۔ آس پاس جو ہجوم ہوتا ہے وہ زیادہ تر انار کلی یا زیب النساء کی نسبت بھی ذرا نچلے درجے کا ہوتا ہے۔[۶]

مصنف ان ائیر لائنز کا تقابل خود تو کچھ اس انداز میں کرتے ہیں کہ ملکی ائیر لائن کی سفری سہولیات کو اچھا نہیں سمجھتے اور غیر ملکی ائیر لائنز کی تعریف کرتے ہیں۔ جبکہ ان کی بیٹی کا نقطہ نظر ان سے کچھ مختلف ہے۔ اس کے بقول پی آئی اے میں سفر کے دوران وہ اداس نہیں ہوتی، اپنوں سے بچھڑنے کا دکھ شدت اختیار نہیں کرتا کیونکہ اس

سفر کے دوران زبان، اخبار، ٹیلی ویژن، ائیر ہوسٹس اور آس پاس کے لوگ سب اپنوں جیسے ہی ہوتے ہیں۔ بلند آواز میں بات کرتے ہیں تو جہاز پُر رونق لگتا ہے۔ جبکہ غیر ملکی ائیر لائن میں ایسا کچھ بھی نہیں ہوتا۔

یوں چھوٹی چھوٹی چیزوں سے یہ تقابل شروع ہو کر تہذیب، ثقافت، جغرافیہ، مذہب، معیشت اور سیاست تک پھیلتا چلا جاتا ہے۔ اور یوں جب ایک تہذیب دوسری تہذیب کے فرق کو قبول کرنے کی بجائے اپنی برتری زور زبردستی کے تحت تسلیم کروانا چاہے تو آہستہ آہستہ پیدا ہونے والے اختلافات بڑے پیمانے پر پیدا ہونے والے تہذیبی تصادم کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

پاکستان جیسے تیسری دنیا اور اس کے باشندوں کو تیسری دنیا کا باشندہ کہا جاتا ہے، اسے حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ جب اس دنیا کا باسی اپنے سفر ناموں میں دو تہذیبوں کے مناظر بیان کرتا ہے تو اس لمحے اس تیسری دنیا کے باسی کی محرومیاں اور ناکامیاں بھی اس میں شامل ہونے لگتی ہیں۔ وہ امریکہ کے شہر نیویارک میں مختلف چیزوں کا تقابل کرتے کرتے آرٹ کی چیزوں کے حوالے سے بھی تقابل شروع کر دیتا ہے۔ جیسے مصنف نے جب ٹائمز سکوئر دیکھنا شروع کیا تو وہاں پر بجنے والی موسیقی کی دھنوں کا تقابل بھی شروع کر دیا، کہ وہاں بجنے والی دھنوں میں خوشی اور سرمستی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ جس سے سننے والا بھی لطف اندوز ہوتا ہے۔ جبکہ مصنف کے بقول پاکستان میں وہ جس دھن کو سننے کے عادی ہیں اس میں خوشی اور سرمستی غائب ہوتی ہے، اس دھن میں اگر کسی چیز کا رنگ غالب ہے تو وہ تکبر، قہر اور غصے کا رنگ ہے۔

> یہ آوازوں کی کبھی مدھم، کبھی ابلتی، کبھی سریلی اور کبھی بے سری سمفنی، یہ شور آزادی اور مسرت کی آبشاروں کے پانیوں کا بلندی سے بے خودی کی چٹانوں پر گرنے کا شور۔۔۔۔۔۔۔۔۔ جبکہ میں اپنے وطن میں اپنے آس پاس جس سمفنی کو سننے کا عادی تھا اس میں مسرت اور بے خودی کی ممانعت تھی۔۔۔۔ ایک ایسی سمفنی جس میں زُہد کے تکبر اور قہر کے سندیسے تھے۔۔۔ جہاں پر خشونت اور غصیلے چہرے ہی شرافت کے معیار تھے اور مسکراہٹ یا خوشی حرام تھی۔۔۔۔۔۔ [۸]

یہاں محض موسیقی کی بے خود اور پر مسرت دھن سے مصنف نے جب تقابل کیا تو اسے اپنے ملک کی دھنوں میں خوشی کی بجائے تکبر اور قہر کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ بے شک نیویارک ایک ایسا شہر ہے جہاں دولت کے پجاری رہتے ہیں لیکن پھر بھی وہاں اُداسی یا خوشی کے رنگ اپنے بھرپور انداز میں چھلکتے نظر آتے ہیں۔ جبکہ تقابل

کے بعد مصنف کو اپنے ملک کی موسیقی میں دہشت کے سُر سنائی دیتے ہیں۔ یوں ایک اداسی کی کیفیت اس کو گھیرے میں لے لیتی ہے۔

ٹائمز سکوئر کے حوالے سے مصنف کا کہنا ہے کہ ٹائمز سکوئر صرف سرمایہ داری نظام اور دولت کی مصنوعی چمک دمک کا ایک کھوکھلا سا منظر ہے۔۔۔ بے شک یہ سکوئر روشنیوں ،رنگینیوں اور دولت کے انباروں کا ایک سرکس تھا۔۔۔ ایک دھوکہ تھا۔

کہیں مصنف امریکہ کی اس تہذیبی برتری کی وجہ سے احساسِ کمتری کا شکار ہوتا نظر آتا ہے اور کہیں ان کے مختلف طور اطوار کا موازنہ اپنی تہذیب سے کرتا ہے۔ اور اس اثر کرتی تہذیب میں جب اسے اس اجنبی شہر میں اپنی تنہائی کا احساس ہوتا ہے تو اسے اپنے علاقے کی یاد ستاتی ہے۔ جیسے مصنف جو صبح کی سیر کا عادی ہے وہ جب نیو یارک میں صبح کی سیر کے لیے نکلتا ہے تو وہاں سب خاموشی سے اپنی اپنی صبح کی ورزشوں میں مصروف نظر آتے ہیں جبکہ پاکستان میں اس سے مختلف ماحول ملتا تھا۔ ماڈل ٹاؤن میں جب وہ سیر کے لیے نکلتے تھے تو قریب سے گزرنے والا ہر شخص ہی انہیں سلام کرتا ہوا گزرتا تھا یوں اس ماحول میں اپنائیت کا احساس رہتا تھا اور یہی اپنائیت جب مصنف کو نیو یارک جیسے زردشیطان کے شہر میں نہیں ملتی تو وہ اداسی اور تنہائی کا شکار ہو جاتا ہے۔

اس تہذیب کے بظاہر تہذیب یافتہ لوگوں کے ایسے رویے سے تہذیبی اختلافات جنم لیتے ہیں۔ وہ تہذیب جو بظاہر خود کو ایک عالمی تہذیب ثابت کرنے کی کوششوں میں ہے مگر وہ اندر سے کتنی کھوکھلی ہے یہ اس وقت معلوم ہوتا ہے جب ایک انسان وہاں رہنا شروع کرتا ہے۔

سیموئل کے نزدیک تہذیبوں کے اختلافات کی ایک وجہ مختلف کلچرز بھی ہیں۔

فیض احمد فیض کلچر کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں:

> عمومی طور پر معاشرہ جس طریقے سے اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کے رہن سہن میں جو چیزیں داخل ہیں وہ بھی کلچر ہے۔ یعنی معاشرے کا کلچر یہ ہے کہ وہاں کے لوگ اس قسم کا لباس پہنتے ہیں، اس قسم کی غذا کھاتے ہیں، اس قسم کے ان کے رسم ورواج ہیں۔[9]

پاکستان ایک اسلامی ملک ہے اس لیے یہاں اسلامی کلچر رائج ہے۔ یہ کلچر مذہب اسلام کی اقدار کا سیٹ ہے جو پاکستانی معاشرے کا ڈھانچہ تشکیل دیتا ہے۔ اسلامی اقدار میں مساوات، رواداری، درگزر، دوسروں کے حقوق کا تحفظ شامل ہے۔ امریکہ میں مختلف قومیں آباد ہیں۔ بظاہر امریکہ میں عیسائیت رائج ہے مگر امریکی معاشرے میں ہر طرف لادینیت کا راج ہے۔ اسلام مساوات کا درس دیتا ہے۔ طبقاتی تقسیم اور نسلی تفاخر اسلامی تعلیمات کا حصہ نہیں ہے۔ لیکن یہ نسلی امتیاز ہمیں نیویارک جیسے شہر میں جگہ جگہ نظر آتا ہے جب انگریز سیاہ فاموں کے ساتھ حقارت آمیز رویہ اپناتے ہیں۔

امریکہ جو اپنے آپ کو ایک تہذیب یافتہ ملک کہتا ہے۔ اور اپنی اقدار و روایات کو آفاقی ثابت کرنے کی کوششوں میں مصروف ہے، بظاہر تو برابری اور آزادی کا علم بردار بنتا ہے مگر وہاں مسلمانوں اور سیاہ فاموں کو جس رویے کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ انتہائی تضحیک آمیز ہے۔ ایک وقت تھا جب انگریز سیاہ فاموں کو قابلِ فروخت شے تصور کرتے تھے، اپنا غلام سمجھتے تھے، ان کے گروپ کو ایک گٹھڑی کہا جاتا تھا۔ نیویارک کے ایک جرنل میں شائع شدہ اشتہار کا ایک اقتباس جو مصنف نے شامل کیا وہ درج ذیل ہے:

> ایک گٹھڑی۔۔(بستہ) تنومند نوجوان نیگرو مردوں کی جن میں سے ایک مرکب شراب بنانے کا ماہر ہے اور دو نوجوان چھوکریاں۔۔ اور دو لڑکیاں جن میں سے ایک سلائی کڑھائی کی ماہر ہے اور اس کی سفارش کی جاسکتی ہے کہ یہ خریدنے کے لائق ہے۔۔۔۔ یہ سب برائے فروخت ہیں۔۔۔۔"[۱۵]

کچھ صدیوں پہلے جب انگریز طاقتور تھے تو وہ ان نیگرو نوجوانوں کے گروپ کو گٹھڑی کہتے تھے، نیلام گھر میں فروخت کرتے تھے۔ مگر اب وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ سیاہ فاموں کی حالت بھی کچھ بہتر ہوئی ہے لیکن اب وہ انگریزوں کے اس ظلم و حقارت کا بھرپور بدلہ اپنے رویے سے لیتے ہیں۔ جو خود تو بلیک ہیں لیکن اب انگریزوں کو بلیک میل کر رہے ہیں۔ سب وے یا پبلک ٹرانسپورٹ کوئی بھی جگہ ہو یہ خود تو پھیل کر بے ڈھب انداز میں بیٹھ جاتے ہیں مگر کسی انگریز کو بیٹھنے کی جگہ نہیں دیتے۔ ایسا کرتے ہوئے ان نیگرو کو یہ لگتا ہے کہ اس عمل سے وہ ماضی میں انگریزوں کی جانب سے جھیلی جانے والی حقارت کا بدلہ لے رہے ہیں۔ جبکہ درحقیقت سفید فام انگریز اب بھی انہیں حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ان سیاہ فاموں کے برابر بیٹھنا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔

بظاہر تو انگریز اپنے آپ کو لبرل کہتے ہیں، سب کے لیے برابری کے حقوق کی بات بھی کرتے ہیں لیکن اپنے اندر سیاہ فاموں کے لیے بہت کڑواہٹ رکھتے ہیں، انہیں ابھی تک حقیر اور کم تر سمجھتے ہیں۔ اس وجہ سے بھی تہذیبی اختلافات پیدا ہوتے ہیں کیونکہ وہ حقوق کی جنگ بھی صرف اپنے ہم رنگوں کی لڑتے ہیں کسی سیاہ فام کے نہ تو کسی حق کو تسلیم کرتے ہیں نہ ان کی آزادی کو مانتے ہیں۔ وہ ان سیاہ فاموں کو انسان کا رتبہ بھی نہیں دیتے تھے۔ اس چیز کا افسوس مصنف اپنی تحریر میں کچھ اس انداز میں کرتے ہیں:

> اگرچہ یقین نہیں آتا کہ ہماری دنیا میں ۔۔۔۔ اللہ کی سیاہ مخلوق کو ہزاروں برس پیشتر نہیں بلکہ چند برس پیشتر تک اور وہ بھی امریکہ ایسے روشن خیال اور تہذیب یافتہ ملک میں تقریباً جانور سمجھا جاتا تھا۔ ۔۔۔ ابھی وہ لوگ موجود ہیں جنہوں نے سفید چوغوں میں روپوش مخروطی ٹوپیوں والی نسل پرست جماعت کلو کلکس کلین کو نیگروز کے گھر جلاتے ۔۔۔ بلکہ انہیں ان کے سمیت جلاتے اور انہیں درختوں سے لٹکا کر پھانسیاں دیتے اور صلیب پر گاڑ کر نذرِ آتش کرتے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔۔۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے ۔۔۔ یہ سینکڑوں برس پہلے کے قصے نہیں ہیں۔۔۔۔[۱۱]

وہ سیاہ فام جن کو انگریز اچھوت سمجھتے تھے، ان کے ساتھ بیٹھنا پسند نہیں کرتے تھے، ان پر ہر طرح کے ظلم روا رکھتے تھے۔ انہی سیاہ فاموں نے نہ صرف اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا بلکہ ہر وہ میدان جہاں کبھی صرف امریکی راج کرتے تھے وہاں سیاہ فاموں کے ناموں کے ڈنکے بجنے لگے۔ جیسے پہلے امریکی سینما میں صرف وہ فلمیں کامیاب ہوتی تھیں جن میں انگریزوں نے کام کیا ہوتا تھا، لیکن آج ہالی ووڈ میں ہر سو سیاہ فام اداکار راج کرتے ہیں۔ باکس آفس پر وہ فلم کامیاب ہی نہیں ہو سکتی جس میں کوئی سیاہ فام چہرہ نظر نہ آئے۔

امریکی سیاہ فاموں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ انہیں زندگی کے کسی بھی شعبے میں اپنے سے آگے تو دور اپنے برابر بھی نہیں دیکھ سکتے خواہ وہ کسی تھیٹر میں بیٹھنے کی جگہ ہی کیوں نہ ہو اگر کہیں انہیں کسی تھیٹر میں کالے کے برابر بیٹھنے کا کہا جائے تو وہ کبھی بھی وہاں نہیں بیٹھتے بلکہ اسے اپنی توہین سمجھتے تھے۔

امریکیوں کی اسی تنگ نظری اور تعصب پسندی کی وجہ سے مختلف تہذیبوں کے درمیان تصادم پیدا ہوتا ہے۔ امریکیوں کی نظر میں سیاہ فام کو ہمیشہ غیر تہذیب یافتہ سمجھا گیا اور امریکیوں نے خود انہیں تہذیب کی روشنی سے

متعارف کروانے کی ذمہ داری لی اور اس دوران باقی سب کے ساتھ کس قسم کا سلوک روا رکھا گیا اس کی ایک مثال کچھ یوں ہے:

> افریکہ کو ہمیشہ ایک تاریک بر اعظم کہا گیا یعنی جہاں تک تہذیب کی روشنی نہیں پہنچی اور اسے سفید فاموں کا بوجھ قرار دیا گیا جن کے ذمے ان وحشیوں کو تہذیب سکھانا تھا۔ اس رویے کا موازنہ آسانی سے آج کی صورت حال میں عراق سے کیا جا سکتا ہے۔ جہاں سے تہذیب انسانی کا آغاز ہوا۔۔۔ بابل، نینوا، بصرہ اور بغداد جیسے شہروں کی ماں۔۔۔ خلیفہ ہارون الرشید نے جب فرانس کے فرمانروا شارلیمان کو خیر سگالی کے طور پر متعدد تحائف روانہ کیے تو ان میں ایک کلاک بھی تھا اور اہل یورپ اسے حیرت سے تکتے تھے کہ وہ وقت جاننے کا کیسا عجوبہ ہے کیونکہ وہ ابھی سورج کے حساب سے وقت کو ناپتے تھے۔۔۔۔۔ تو اسی عراق پر یورپ اور امریکہ حملہ کر کے۔۔۔ اس پر قابض ہو کر کہتے ہیں کہ ہم تو یہاں صرف تہذیب سکھانے آئے ہیں۔۔۔ اس دوران اگر سات لاکھ عراقی شہری مارے جاتے ہیں تو تہذیب کے لیے یہ کوئی بڑی قیمت نہیں۔۔۔۔ [۱۲]

امریکہ کا یہ رویہ کہ صرف اس کی تہذیب ہی ایک بہترین تہذیب ہے اور وہ باقی تمام دنیا کو ان کی اسی تہذیب کا حصہ بننا چاہیے تو اس وجہ سے بھی تہذیبی تصادم شروع ہوتے ہیں۔

امریکہ جو یہ سمجھتا ہے کہ دنیا کے باقی تمام لوگوں کو تہذیب اس نے سکھائی ہے حقیقت اس کے بالکل بر عکس ہے کیونکہ افریقہ کے بیشتر خطے اُن دنوں بھی انتہائی تہذیب یافتہ تھے جب یورپ مکمل تاریکی میں تھا۔۔۔۔ وہاں بڑی سلطنتوں اور ثقافتوں نے جنم لیا۔۔۔ بے شک اس کے کچھ حصوں میں آزاد اور اپنی مرضی سے حیات بسر کرنے والے قبیلے تھے جن کے رسم و رواج یورپ سے مختلف تھے لیکن وہ وحشی تو ہر گز نہ تھے کہ یورپ کے نزدیک ہر وہ معاشرہ جو اس کی اقدار سے جدا اقدار پر عمل پیرا ہو وحشی گردانا جاتا ہے۔ انہیں اپنی تہذیبی برتری جتانے کے لیے بہر طور افریقہ اور ایشیا کو غیر مہذب ثابت کرنا تھا۔

اس زبردستی نے تہذیبی تصادم کو جنم دیا۔ کیونکہ امریکی اپنی تہذیب کی برتری کو ثابت کرنے کے لیے کسی بھی حد تک جا رہے تھے۔

امریکہ میں ایشیائی لوگوں کے ساتھ جو حقارت آمیز رویہ اختیار کیا جاتا ہے اس کا بیان بھی ہمیں اس تحریر میں نظر آتا ہے۔ مصنف کا یہ خیال تھا کہ اسلام جو سیاہ فاموں سے خصوصی لگاؤ رکھتا ہے اور اس کا بنیادی سبب یہی ہے کہ اس میں رنگ اور نسل میں کسی کو برتری حاصل نہیں، اللہ کے نزدیک سب برابر ہیں اور صرف وہ برتر ہیں جو پرہیز گار اور اطاعت گزار ہیں۔ اس حوالے سے سب سے بڑی کشش حضرت بلال حبشی ہیں۔

مصنف کا خیال تھا کہ ایشیائی باشندے بشمول پاکستانیوں کے امریکی نیگروز کے لیے دل میں نرم گوشہ رکھتے ہوں گے اور اسی طرح نیگروز ایشیائی لوگوں کو اپنا سمجھتے ہوں گے جبکہ حقیقت میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ بلکہ کالے ان ایشیائی لوگوں کو اپنا حریف تصور کرتے ہیں کہ جتنے بھی گوروں کے نزدیک ناپسندیدہ جاب ہوتے ہیں، ان کے لیے یہی دو نسلیں امیدوار ہوتی ہیں اور چونکہ ایشیائی قدرے فرمانبردار یعنی "یس سر" اور "جو حکم جناب عالی" قسم کے ہوتے ہیں اور ادھر کالے "فک یو" اور "گو ٹو ہیل" خصلت کے مالک ہوتے ہیں اس لیے اس نوعیت کے خاکروبی، کوڑے کے ڈرم اٹھانے والے۔۔۔۔ یا ریستوران میں برتن دھونے والے جتنے بھی کام ہوتے ہیں ان کے لیے عام طور پر گورے ایشیائی لوگوں کو منتخب کرتے ہیں۔۔۔۔ چنانچہ اس بنا پر قابلِ فہم طور پر کالے انہیں عزیز نہیں رکھتے۔

امریکہ میں ایشیائی لوگوں کے ساتھ حقارت آمیز رویہ اپنایا جاتا ہے، فرمانبردار غلاموں والی تمام نوکریوں کے لیے ایشیائی لوگوں کو منتخب کیا جاتا ہے۔ جہاں ان کی تذلیل بھی کی جاتی ہے اور اپنی برتری بھی ثابت کر دی جاتی ہے۔

بانو قدسیہ نے بھی اپنے ناول حاصل گھاٹ میں مشرقی اور مغربی تہذیبوں کے درمیان موجود تصادم کو بیان کیا ہے۔ اور اس میں وہ اشتراکات و اختلافات دونوں بیان کرتی ہیں۔۔ بانو قدسیہ کو ماضی کی مشرقی تہذیب دیکھ کر دکھ ہوتا ہے۔ وہ حاصل گھاٹ میں مشرقی تہذیب کو اسلامی تہذیب کے معنوں میں لیتی ہیں۔ ان کے مطابق ایک وقت تھا جب مشرق روحانی طور پر مغرب سے زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ مشرق نے ساری دنیا کو فلاح کی ترقی عنایت کی تھی۔ مشرق کی روحانی ترقی اور چیز تھی اور مغرب کی معاشی ترقی اور علم مختلف چیز ہے۔ مغربی تہذیب مادی ترقی کی پجاری ہے جبکہ مشرقی تہذیب کے راستے فلاح کی طرف نکلتے ہیں۔

بانو قدسیہ ناول میں مشرق اور مغرب کے حوالے سے کہتی ہیں "مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب اور یہ دونوں کبھی مل نہیں سکتے۔"[۳۱]

تیسری دنیامیں اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب کے اس تصادم میں مغربی تہذیب کی اندھا دھند تقلید ہو رہی ہے۔ مغربی تہذیب کی بنیاد مادی ترقی اور شخص آزادی پر رکھی گئی ہے۔امریکہ میں شخصی آزادی سے وہ تمام رسیاں کٹ گئی جن میں تہذیب انسان کو باندھتی ہے۔

جغرافیہ کسی بھی علاقے کی تہذیب و ثقافت، رسم ورواج، اشیائے ضروریات اور لباس وغیرہ کی حدود طے کرنے کے حوالے سے اہمیت رکھتاہے۔ نیو یارک کے سو رنگ میں مصنف اسی جغرافیائی فرق کی وجہ سے پیدا ہونے والے لباس اور خوراک کے فرق کو یوں بیان کرتے ہیں:

> لباس بھی کوئی ایک نہ تھا۔۔۔ جس کے جی میں جو آیا تھاوہ اس نے پہن لیا تھا۔۔۔اگر جی میں نہیں آیا تھاتو صرف وہاں پہنا تھاجہاں جہاں مجبوری تھی۔۔۔لوگ چار گرہ میں بھی تھے اور تھری پیس سوٹوں میں بھی۔۔ البتہ نیلی جینوں کی اکثریت تھی۔اسی طور امریکہ میں پائی جانے والی خوراک کا بھی کوئی خاص عقیدہ یادین ایمان نہ تھا۔۔۔ [۱۴]

آرٹ دراصل انسانی جذبات کو دودوسروں تک پہنچانے کا راستہ ہے۔ فنون لطیفہ سے مراد جذبات کا اظہار اوردل کو چھولینے والی کسی تخلیق کا جنم لینا ہے۔اسی لیے مصوری، مجسمہ سازی، تصویر کشی، تعمیرات، موسیقی، تھیٹر، رقص اور فلم جیسے شعبوں کو فنون لطیفہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ مصنف جب امریکہ میں ان فنونِ لطیفہ کو دیکھتا ہے اس وقت بھی حیرت سے گنگ رہ جاتا ہے۔

امریکہ کا میٹروپالیٹن میوزیم آف آرٹ ایک ایسامیوزیم ہے جو دنیابھر کی تہذیبوں کا امین ہے۔ یہ ایک ایسا میوزیم ہے جہاں آپ ہر خطے کی قدیم وجدید تہذیب وثقافت دیکھ سکتے ہیں۔ امریکہ نے اس میوزیم کی ایک ایک چیز کی تعمیر اس انداز میں کی ہے کہ دیکھنے والا مبہوت رہ جاتا ہے اور تیسری دنیاکا باشندہ احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس میوزیم کے حوالے سے مصنف کا کہنا ہے کہ:

> یہ ایک انسائیکلوپیڈیا ہے جسے آپ پڑھتے نہیں بلکہ دیکھتے ہیں اور اس میں سانس لیتے ہیں۔۔۔۔ دنیا بھر کے فنون کی۔۔۔ ہر خطے کی قدیم تاریخ کی۔۔۔ فلارنس اطالیہ سے لے کر نیوگنی انڈونیشیاتک اور ازمنہ قدیم سے تقریباً عہدِ حال تک۔۔۔۔۔۔۔ [۱۵]

نیویارک میں موجود مختلف میوزیمز کو دیکھتے ہوئے مصنف اس چیز کی تعریف بھی کرتے ہیں کہ کس طرح انہوں نے تہذیبوں کے آثارِ قدیمہ کو سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ انہوں نے امریکہ اور یورپ کے تمام اہم واقعات کو حوالوں کے ساتھ جمع کر رکھا تھا۔ چاہے وہ ڈائناسور یا بن مانس کے ڈھانچے ہوں یا امریکہ کے کسی قدیم جنگل کا درخت ، اس کے تنے پر موجود دائروں کے ذریعے اپنی تاریخ اور تمام اہم واقعات کو لکھ رکھا ہے۔ یہ سب انہوں نے تحقیق کے بعد جمع کیا۔ ان سب چیزوں کو دیکھتے ہوئے مصنف احساسِ کمتری کا شکار ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے ایک درخت کے تنے پر موجود دائروں کے ذریعے اپنے تاریخی واقعات کو سنبھالا ہوا ہے اور ایک ہم ایشیا کے لوگ ہیں جن کے پاس تاریخی واقعات اور قدیم تہذیب کے آثار کی بھرمار ہے مگر ہم ان کی حفاظت کر سکے ، نہ ان کو سنبھال سکے۔ اس کی وجہ مصنف کے نزدیک کچھ یوں ہے:

> ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں اور اپنا ایک ایسا ہسٹری میوزیم تخلیق نہیں کرتے۔۔۔۔ اس لیے کہ ہم کر ہی نہیں سکتے۔۔۔ ہم میں تحقیقی اور علمی جستجو کے لیے جو ثابت قدمی، صبر اور مشقت درکار ہے وہ سرے سے ناپید ہے۔۔۔[۱۹]

امریکہ نے بظاہر تو اپنا تاثر ایک ایسی تہذیب کا بنا رکھا ہے جو ہر لحاظ سے مکمل ہے، سراہے جانے اور پیروی کیے جانے کے قابل ہے۔ اس ملک میں، یہاں کی تہذیب میں اخلاقی اقدار بھی شامل ہیں جن میں امریکیوں کا طرزِ عمل کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہیں ہے۔ اخلاقی اقدار میں زندگی کے بہت سے معاملات میں انصاف بھی شامل ہے۔ خرید و فروخت کے معاملات کس انداز میں طے ہوتے ہیں یہ تمام چیزیں بھی اخلاقی اقدار میں شامل ہیں۔

اس سفر نامے میں مصنف نے طنزیہ انداز اختیار کرتے ہوئے امریکیوں کے خرید و فروخت کے انداز کو بیان کیا ہے۔

نیویارک ایک ایسا شہر جو لوئر مین ہیٹن کے ایک علاقے سے شروع ہوا اس پر زبردستی قبضہ کیا گیا اور ایک ایسے سودے کی شکل میں تاریخ میں پیش کیا گیا جو کھرا سودا تھا جبکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی۔ وہ جزیرہ جس کی قیمت لاکھوں میں تھی اسے انصاف پسند امریکیوں نے محض چند قیمتی موتیوں اور منکوں کے عوض حاصل کیا۔

ایک جزیرہ جہاں اب امریکی معیشت اپنے قدم جمائے کھڑی ہے اس جگہ کو کس زور زبردستی کے انداز میں حاصل کیا اور اسے ایک انصاف پسند سودے کا نام دیا گیا۔ یہ گوری قوم کے انصاف کی ایک ادنی سی مثال ہے۔

جہاں مصنف نے انگریزوں کی بہت سے عادتوں اور ان کے طور طریقوں پر طنز کیا ہے وہاں ان کی بہت سی اچھی چیزوں کی تعریف بھی کی ہے جیسے وہاں موجود پبلک لائبریری۔ اس لائبریری کو دیکھتے ہی مصنف کو ایک الگ ہی احساس ہوتا ہے کہ کس طرح انہوں نے قدیم کتابوں کو، علم کے اس خزانے کو محفوظ کر رکھا ہے۔

اس لائبریری کو دیکھتے ہی مصنف کے اندر پھر سے وہ محرومی جنم لینے لگی کہ ہم کیوں اپنے ماضی سے اس قدر دور ہو گئے ۔ ہم بھی تو کبھی ایسے ہی کتابوں کی حفاظت کرنے والے تھے۔ ایسے ہی کئی بڑے کتب خانے بنائے تھے مگر اب ہم ایسے نہ رہے۔ اب ہمارے اندر وہ صلاحیتیں نہیں رہیں کہ ہم اپنے تہذیبی ورثے کی حفاظت کر سکیں ۔ اس محرومی کا ذکر کچھ یوں ملتا ہے:

> میں نے بہت ضبط کیا کہ آنکھوں کی سرخی میں سے جو نمی پھوٹنے لگی ہے اسے ظاہر نہ ہونے دوں ، آنکھیں نہ جھپکوں، مبادا یہ سرخ جام چھلک جائیں اور سب جان جائیں کہ یہ شرمندگی کے آنسو ہیں۔ کہ ہم ایسے کیوں نہیں۔۔۔۔ ہم کبھی ایسے ہی تھے۔۔۔۔ قرطبہ، دمشق، بغداد، سمرقند اور بخارا میں ہم بھی ایسے ہی معبد تعمیر کیا کرتے تھے۔۔۔ اور ان زمانوں میں ہر کتاب ہاتھ سے لکھی جاتی تھی۔۔۔۔۔۔ ہاتھ سے لکھے جانے کے باوجود کتابوں کی تعداد لاکھوں میں پہنچتی تھی۔۔۔[۲۱]

نیویارک پبلک لائبریری دنیا کی دسویں سب سے بڑی لائبریری ہے ۔ اس لائبریری میں مذہب ، عقیدے، تاریخ، ثقافت یا جغرافیے کی کوئی قید نہیں ہے۔ اس لائبریری کے ایک ہال میں دنیا کے تمام قدیم ترین نقشے نمائش پر تھے۔ ان نقشوں میں یورپ، ایشیا، امریکہ کے اولین تفصیلی نقشے، سرزمینیں، سمندر، جزیرے اور صحرا، سینکڑوں برس پہلے کے تمام نقش جمع تھے۔ اسی لائبریری میں پرانے شعرا، ادبا کی تصانیف اور ان کے کلام کے اصل مسودے جس طرح امریکیوں نے سنبھال رکھے ہیں، اس انداز میں ہم اپنے ادبا اور شعرا کے کلاام کی حفاظت نہ کر سکے۔ جس کا افسوس مصنف کے انداز میں اس لمحے جابجا نظر آتا ہے جب انہوں نے پبلک لائبریری کو دیکھا۔

امریکیوں کی اسی علم دوستی کی بنا پر مصنف نے گورکی کے اس نقطہ نظر سے اختلاف کیا جس میں اس کا کہنا تھا کہ نیویارک دراصل زرد شیطان کا شہر ہے۔ مصنف نے اس نقطہ نظر سے اختلاف اس انداز میں کیا:

لائبریری کے باہر وہی زر و شیطان کا شہر پھنکار رہا تھا۔۔۔۔ دولت کی ہوس کا شہر۔۔۔ لیکن مجھے گور کی سے یہاں تھوڑا سا اختلاف تھا کہ یہ صرف زر و شیطان کا شہر ہی نہیں بلکہ علم کے سنہری فرشتوں کا شہر بھی ہے۔۔۔ [۱۸]

امریکیوں نے اپنی تہذیب کو آفاقی تہذیب ثابت کرنے کے لیے اسی طرح لوگوں کو متاثر کرنا شروع کیا۔ جو علم و فن کے چاہنے والے تھے انہیں اپنے اس انداز سے متاثر کیا۔

الغرض ثقافتی عالمگیریت کی خواہش کی وجہ سے جب دنیا کی دیگر تہذیبوں کی انفرادی حیثیت کو تسلیم کرنے کی بجائے ان پر کسی ایک ملک کی تہذیب و ثقافت کو زبردستی لاگو کروانے کی کوشش کی جائے تو نتائج تہذیبی تصادم کی صورت میں رونما ہوتے ہیں۔ اور یہ تہذیبی تصادم مستقبل کے لیے خطرے کا الارم ہیں کہ اس زبردستی کی وجہ سے دنیا کی دیگر تہذیبوں میں امریکی تہذیب کے حوالے سے اچھے جذبات موجود نہیں ہیں۔ دنیا کی خوبصورتی دراصل مختلف تہذیبوں کی وجہ سے ہی قائم ہے کہ دنیا کے ہر خطے میں الگ رسم و رواج، تہذیب و ثقافت ملتی ہے جس کی وجہ سے دنیا میں اتنے رنگ ملتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ غفور شاہ قاسم،مستنصر حسین تارڑ : شخصیت و فن(اسلام آباد:اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۱۸ء)،ص ۱۴۱۔

۲۔ مستنصر حسین تارڑ،نیو یارک کے سو رنگ(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۸ء)، ص۲۶۔۲۷۔

۳۔ ایضاً،ص۱۲۵۔

۴۔ سیموئیل پی۔ ہنٹنگٹن،تہذیبوں کا تصادم،مترجم احسن بٹ(لاہور:مثال پبلشنگ ۲۰۰۳ء)، ص۲۳۶۔

۵۔ طاہر کامران،کلونیل ازم : نظریہ اور بر صغیر پر اس کا اطلاق،ص۴۲۔

۶۔ فیض احمد فیض،ہماری قومی ثقافت(کراچی:ادارہ یادگارِ غالب،۱۹۷۶ء)،ص۱۷۔

۷۔ مستنصر حسین تارڑ،نیو یارک کے سو رنگ(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۸ء)، ص۱۴۔

۸۔ ایضاً،ص۲۹۔۳۰۔

۹۔ فیض احمد فیض،ہماری قومی ثقافت(کراچی:ادارہ یادگارِ غالب،۱۹۷۶ء)،ص۱۷۔

۱۰۔ مستنصر حسین تارڑ،نیو یارک کے سو رنگ(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۸ء)،ص۹۲۔

۱۱۔ ایضاً،ص۱۰۔

۱۲۔ ایضاً،ص۱۰۳۔

۱۳۔ بانو قدسیہ،حاصل گھاٹ(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۸ء)،ص۱۳۰۔

۱۴۔ مستنصر حسین تارڑ،نیو یارک کے سو رنگ(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۸ء)، ص۵۴۔۵۵۔

۱۵۔ ایضاً،ص۱۵۰۔

۱۶۔ ایضاً، ص۲۵۸۔

۱۷۔ ایضاً، ص۳۷۹۔

۱۸۔ ایضاً، ص۴۰۲۔

باب سوم:

سفر نامے میں مذہب کی بنا پر پیدا ہونے والے اختلافات کا تجزیاتی مطالعہ

باب سوم:

سفر نامے میں مذہب کی بنا پر پیدا ہونے والے اختلافات کا تجزیاتی مطالعہ

مذہب میں فرق کی وجہ سے تہذیبی اختلافات کا جنم:

مذہب جو کسی بھی ملک کی اہم بنیاد ہے اس میں فرق کی وجہ سے رہن سہن، رسم و رواج اور تہذیب و ثقافت میں فرق آجاتا ہے جو تہذیبی اختلاف کی وجہ بنتا ہے۔

کسی مخصوص علاقے کی مذہبی روایات میں وہاں کے لوگوں کا کائنات کو دیکھنے اور سمجھنے کا انداز کار فرما ہوتا ہے۔ مثلاً زراعتی معاشروں میں بارش کا دیوتا ہوتا ہے تو خانہ بدوش معاشروں میں شکار کا۔ یہ کہنا درست نہیں کہ مذہب اپنے سے متعلقہ علاقہ کے لوگوں کی روحانی ضروریات کو پورا کرتا ہے۔ بلکہ اس کے برعکس یہ کہنا چاہیے کہ کسی خطہ کے لوگ اپنے روحانی تقاضے پورے کرنے کے لیے جو امتناعات، پابندیاں، اُصول و قوانین، ضوابط وغیرہ عائد کرتے ہیں اُن کا مجموعہ مذہب کہلاتا ہے۔

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی معاشروں میں تنازعات، فساد اور خون ریزی کے اسباب میں سے ایک بہت بڑا سبب انسانوں کے مابین پایا جانے والا مذہبی اختلاف رہا ہے۔ مذہب کا تعلق چونکہ انسان کے ایمان وعقیدہ سے ہوتا ہے اور مختلف مذہبی گروہ اپنے اختیار کردہ عقیدے کو حق اور دوسرے عقائد کو باطل تصور کرتے ہیں، اس لیے ان میں مذہبی جذبے کے تحت دوسرے عقائد اور مذاہب کو مٹانے یا ان کے پیروکاروں پر جبر اور زبردستی کرنے کا رویہ پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ قدیم زمانوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ کسی معاشرے میں عمومی طور پر جس مذہب کی پیروی کی جاتی اور خاص طور پر جس مذہب کو حکمرانوں کی سرپرستی میسر ہوتی، جبر اور تشدد کے ذریعے سے مملکت کے سارے باشندوں کو اس کے دائرے میں لانے کی کوشش کی جاتی تھی اور اس سے ہٹ کر دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے لیے عام طور پر عقیدہ اور مذہب کی آزادی کا حق تسلیم نہیں کیا جاتا تھا۔

اس پس منظر میں جب ہم اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب قرآن مجید میں دنیا میں موجود مذہبی اختلافات کے حوالے سے دی جانے والی راہ نمائی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ایک بہت مختلف اور حیرت انگیز صورت حال ہمارے سامنے

آتی ہے۔ قرآن مجید میں دین وعقیدہ کے حوالے سے جو بنیادی بات فرمائی ہے، وہ یہ ہے کہ مذہب اور اعتقاد کا معاملہ ہر انسان کے اپنے ذاتی فیصلے اور اختیار پر مبنی ہے اور اس معاملے میں زور زبردستی کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ یہ دنیا اللہ نے انسانوں کے علم و عقل اور عمل کی آزمائش کے لیے بنائی ہے جس کے لیے انسانوں کو عقیدہ و عمل کی آزادی کا حاصل ہونا لازم ہے۔ اس وجہ سے دنیا میں مذہبی اختلافات رہیں گے اور اس اختلاف کو ختم کرنے کے لیے کسی گروہ کو دوسرے گروہ پر مذہبی جبر کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں۔ ہدایت کی راہ، گمراہی سے بالکل واضح ہو چکی ہے۔ سو جس نے طاغوت کا انکار کیا اور اللہ پر ایمان رکھا، اس نے ایک مضبوط سہارے کو تھام لیا جو کبھی ٹوٹے گا نہیں اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔" (البقرۃ ۲۵۶)

مذاہب میں فرق کی وجہ سے پیدا ہونے والے تصادمات بہت سنگین نوعیت کے ہوتے ہیں۔ مختلف وجوہات کی بنا پر اپنا ملک چھوڑنے والے مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے مذہبی عقائد، رسم و رواج، زندگی گزارنے کے طور طریقے، ان کی تہذیب و ثقافت سب مختلف تھی۔ مذہب کے اس فرق کی وجہ سے بھی تارکین وطن سے مغربی لوگ خوفزدہ تھے۔

خاص طور پر ۱۹۹۰ء کی دہائی میں یورپ میں تارکین وطن میں زیادہ تعداد مسلمانوں کی تھی جس سے یورپ کے لوگ خوفزدہ تھے کہ کہیں مسلم اکثریت ان پر حاوی نہ ہو جائے اور ان کی اپنی تہذیب و ثقافت کہیں پیچھے نہ رہ جائے۔ کیونکہ مسلم برادری میزبان ملکوں کی ثقافت میں ضم نہیں ہوتی بلکہ اپنی علیحدہ شناخت قائم رکھتی ہے۔ جس کی وجہ سے یورپ والے مسلم برادری سے خاص طور پر خوفزدہ تھے۔ تاریخی واقعات پر اگر نظر ڈالی جائے تو اسلام وہ واحد تہذیب ہے جس نے مغرب کی بقا کو خطرے میں ڈالا۔ ۱۹۲۹ء کے درمیان مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والی دو ریاستوں میں ہونے والی جنگوں میں سے ۵۰ فیصد جنگیں مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان تھیں۔ ان دونوں مذاہب کے درمیان جھگڑا ایک طرف تو اختلاف کی پیداوار تھا خصوصاً اسلام کا تصور بطور ایک طرز حیات کے جو مذہب اور سیاست کو جوڑتا ہے اور ان پر حاوی رہتا ہے بمقابلہ مغربی عیسائیت کا تصور جس میں خدا کی سلطنت اور سیزر کی سلطنت الگ الگ ہیں۔ تاہم جھگڑا ان مذاہب کی مماثلتوں سے بھی پھوٹتا ہے۔ دونوں مذاہب وحدانیت پرست ہیں، دنیا کو ثنویت کے نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں، دونوں ہی آفاقیت پسند ہیں، دونوں مذاہب دعوی دار ہیں کہ

ان کا عقیدہ ہی واحد سچا عقیدہ ہے جس سے تمام انسانوں کو وابستہ ہونا چاہیے۔ دونوں تبلیغی (مشنری) مذاہب ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ ان کے ماننے والوں کی ذمہ داری ہے کہ لوگوں کو واحد سچے عقیدے کی طرف لائیں۔ اسلام آغاز ہی سے فتوحات کے ذریعے پھیلا اور عیسائیت بھی اکثر ایسا ہی کرتی رہی ہے۔

ہنٹنگٹن اسلام اور عیسائیت کے مابین جھگڑے کی درج ذیل وجوہات بیان کرتا ہے:

اول: مسلم آبادی کی مسلسل بڑھتی ہوئی تعداد نے بیروزگاری اور مایوسی کو جنم دیا جس کی وجہ سے بہت سے لوگ مغربی ممالک کی طرف نقل مکانی کر گئے۔

دوم: اسلامی احیاء نے مغرب کے مقابلے میں مسلمانوں کو اپنے جداگانہ کردار پر نئے سرے سے اعتماد بخشا اور اپنی تہذیب اور اقدار کی قدروقیمت سے آشنا کروایا۔

سوم: مغرب کا اپنی اقدار کو آفاقی بنانے کی کوششوں، اپنی فوجی اور معاشی برتری کو برقرار رکھنے اور مسلم دنیا کے جھگڑوں میں مداخلت سے مسلمانوں کے اندر مغرب کے خلاف نفرت کا جذبہ شدت اختیار کر گیا ہے۔

چہارم: کمیونزم کے انہدام نے مغرب اور اسلام کے مشترکہ دشمن کو ختم کر دیا ہے اور دونوں کو ایک دوسرے کے لیے بڑا خطرہ بنا دیا ہے۔ تعامل اور تال میل نے بھی ایک ملک میں بسنے والے دوسری تہذیب سے متعلق لوگوں کے حقوق کے حوالے سے اختلافات کو بڑھا دیا ہے۔

اسلام اور مغرب میں نئے جھگڑے کی بنیاد طاقت اور ثقافت کے مسئلوں پر رکھی ہے۔ کبھی یہ بھی کہا جاتا رہا ہے کہ ان کے درمیان جھگڑے کا ایک بڑا مسئلہ علاقے پر قبضے کا بھی ہے لیکن بعد میں یہ بات واضح ہو گئی کہ سب کی سرحدیں الگ ہیں کہیں بھی کسی کے علاقے پر قبضہ نہیں کیا گیا بلکہ اسلام اور مغرب کے درمیان جھگڑے علاقے کی بنیاد پر نہیں بلکہ بین التہذیبی مسائل کی وجہ سے ہو رہے ہیں مثلاً ہتھیاروں پر روک تھام، انسانی حقوق اور جمہوریت

کے مغربی تصورات کا جبری تسلط، تیل پر قبضہ، ترکِ وطن، اور مغربی مداخلت وہ بین التہذیبی مسائل ہیں جن کی وجہ سے مغرب اور اسلام کے مابین تصادمات رونما ہو رہے ہیں۔

ایک نمایاں ہندوستانی مسلم کی پیش گوئی جو ہنٹنگٹن نے اپنی کتاب میں شامل کی وہ یہ ہے کہ "مغرب کا اگلا تصادم مسلم دنیا سے یقینی طور پر ہونے والا ہے۔"[۱۱]

تصادم کی موجودہ صورت حال کا اقبال کی فکر سے موازنہ کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے بھی تہذیبوں کی ہنگامہ آرائیوں کا تذکرہ کیا ہے اور یہ ہنگامہ آرائی تصادم کی ہی ایک صورت ہے۔

اقبال نے اپنے مضمون قومی زندگی میں لکھا ہے:

> ایک زمانہ تھا جب اقوامِ دنیا کی باہمی معرکہ آرائیوں کا فیصلہ تلوار سے ہوا کرتا تھا اور یہ فولادی حربہ دنیائے قدیم کی تاریخ میں ایک زبردست قوت تھی، مگر حال کا زمانہ ایک عجیب زمانہ ہے جس میں قوموں کی بقا، ان کے افراد کی تعداد، ان کے زورِ بازو اور ان کے فولادی ہتھیاروں پر انحصار نہیں رکھتی بلکہ ان کی زندگی کا دارومدار اس کاٹھ کی تلوار پر ہے جو قلم کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔۔۔۔ ہاتھوں کی لڑائی کا زمانہ گزر چکا، اب دماغوں، تہذیبوں اور تمدنوں کی ہنگامہ آرائیوں کا وقت ہے، اور یہ جنگ ایک ایسی جنگ ہے جس کے زخم رسیدہ زنگاری اور کافوری مرہم سے ہرگز اچھے نہیں ہو سکتے۔[۱۲]

عرصہ پہلے علامہ اقبال بھی تہذیبوں کے درمیان ہونے والی ہنگامہ آرائیوں کے متعلق لکھ چکے ہیں۔ اور ان کے بقول اس ہنگامہ آرائی کے بعد لگنے والے زخم ناسور کی طرح ہوں گے جن کا علاج ناممکن ہو گا۔ کیونکہ تہذیبوں کے درمیان پنپنے والے تضادات جب ایک بڑی سطح پر پہنچتے ہیں تو اس کی وجہ سے تہذیبوں کا جو نقصان ہوتا ہے اس کا ازالہ نہیں ہو سکتا۔

اکیسویں صدی عیسوی میں تہذیبوں کی کشمکش نے جو عالمی صورتحال پیدا کر دی ہے، وہ کئی اعتبار سے تشویشناک ہے۔ اقوام کے درمیان مفادات کی جنگ نے ظلم اور استحصال کی قبیح صورتیں اختیار کر لی ہیں۔ علامہ محمد اقبال نے نظم و نثر میں اپنا جو علمی کارنامہ پیش کیا ہے، اس کا مطالعہ تہذیبوں کی اس کشمکش میں امن و سلامتی

کا پیغام پیش کر تا ہے۔ وہ مطالعہ احترامِ آدم کی اقدار پر مشتمل اس راستے کی نشاندہی کر تا ہے جس کی منزل اقوامِ عالم میں رنگ و خون اور زبان و جغرافیہ کے امتیازات سے بالاتر ہے۔

انسانی وحدت اور احترامِ آدم اسلام کے بنیادی عقائد اور اساسی تعلیمات میں شامل ہیں۔ اقبال احترامِ آدمیت کے شاعر ہیں اور اس کے مستقبل کی درخشانی کے لیے کائنات کی مادّی تعبیر کے ساتھ اس کی روحانی تعبیر کو سائنسی بنیادوں پر پیش کرتے ہیں، وہ عالمِ انسانیت کے مستقبل کا ایک واضح وژن اور مشن رکھتے ہیں۔ برصغیر میں ایک اسلامی ریاست کی تشکیل کا تصور انہوں نے اسی مشن کی تکمیل کے لیے پیش کیا تھا کہ انسانیت کی ایمانی، اخلاقی اور روحانی بالیدگی اور نشو و نما کے لیے ایک ماڈل وجود میں لایا جائے جو ریاستِ مدینہ کے رنگ اور آہنگ میں ڈھلا ہوا ہو۔ اقبال کے نزدیک یہی وہ نظام اور پیغام ہے جس سے ایک عالمی تہذیب وجود میں آسکتی ہے:

تفریقِ ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود\
اسلام کا مقصود فقط ملّتِ آدم\
مکّے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام\
جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم

ایک تیونسی قانون دان کے مطابق نو آبادیات نے بھی اسلام کی ثقافتی روایات کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ تصادم مذہب کے درمیان نہیں بلکہ دراصل تہذیبوں کے درمیان تصادم ہے۔

ہنٹنگٹن نے اپنی کتاب میں مذہب اسلام کو براہِ راست ہدف قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

Islam as the global rival of the west.[۳]

یعنی مغرب مذہب اسلام کو اپنے سب سے بڑے دشمن کے طور پر دیکھتا ہے۔ یہ مغرب کا تضاد ہی ہے کہ اس نے اسلامی ممالک کے مجاہدین کو دہشتگرد قرار دے دیا۔ ان کے ساتھ غیر انسانی سلوک روا رکھا گیا۔ روحانی ترقی کے خواہش مند بنیاد پرست کہلائے جانے لگے۔ امریکی تہذیب نے یوں تو مذہب کو ہر فرد کا ذاتی معاملہ قرار دیا، تو سوچنے کی بات یہ ہے کہ پاکستان کا ہر مجاہد انہیں دہشتگرد کیوں نظر آتا ہے؟ اس کی ایک بڑی وجہ اسلام سے ان کا خوف بھی ہے کیونکہ انہیں لگتا ہے کہ مذہب اسلام کے ماننے والے اپنے اصل کی طرف لوٹیں گے تو یقیناً دنیا پر دوبارہ

حکمرانی ان کی ہو گی۔ اسی خوف کے زیرِ اثر انہوں نے محض گیارہ ستمبر والے واقعے کو بنیاد بنا کر مسلمانوں کی نسل کشی شروع کر دی۔ اپنے آپ کو مظلوم بنا کر دنیا کے سامنے مسلمانوں کو ظالم دکھایا تاکہ ان کے کسی اقدام پر بھی سوال نہ اُٹھایا جاسکے۔ بلکہ ان کے ہر قدم کو اپنی حفاظت اور اپنے دفاع میں اٹھایا گیا قدم ہی سمجھا جائے۔

مستنصر حسین تارڑ نے بہت سے یورپی اور امریکی ممالک کے سفر کیے۔ یورپ اور امریکہ کے سفر کے دوران جہاں دیگر حوالوں سے معلومات اکٹھی کیں وہی مذہبی حوالے سے بھی لوگوں کے نقطہ نظر کو دیکھا۔ انہوں نے مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے اعتقادات، مذہبی جوش و جذبے کو دیکھا اور ان سب کو اپنے سفر نامے کا حصہ بنایا۔

ان کے سفر نامہ نیو یارک کے سو رنگ میں ہنٹنگٹن کی پیش کردہ تھیوری "تہذیبی تصادم" میں مذہب کے فرق سے پیدا ہونے والے تہذیبی تصادمات کو دیکھا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ مذہب کے فرق کی وجہ سے رونما ہونے والے تہذیبی تصادمات زیادہ خطرناک ہیں۔ کیونکہ مذہب کسی بھی قوم یا تہذیب کی وہ بنیاد ہے جس پر اس قوم کی عمارت کھڑی ہے۔ مذہب اور قوم کے اسی تعلق کے حوالے سے عبدالرحمن شوق امرتسری کا کہنا ہے کہ:

> مذہب اس نیک اصول کا نام ہے جس سے کسی قوم یا سوسائٹی کی اصلاح کی جائے تاکہ وہ عملی طور پر انسانی کمالات تک پہنچ سکے۔۔۔ جس قوم کے اصولِ مذہب درست نہ ہوں وہ کبھی شرفِ انسانی حاصل نہیں کر سکتی۔ اس طرح وہ قوم بھی جس کے اصولِ مذہب گو بہت مفید ہوں لیکن وہ ان پر عمل نہ کرے تو انسانی شرافت سے گر جاتی ہے۔[۳]

مختلف مذاہب کے ماننے والے جب ایک جگہ پر جمع ہوں اور کسی ایک مذہب کے ماننے والوں کو طنز و حقارت کا نشانہ بنایا جائے تو اس وجہ سے بھی تہذیبی اختلافات رونما ہوتے ہیں۔ جیسے گیارہ ستمبر والے حملے کے بعد خصوصی طور پر جب امریکہ میں مسلمانوں پر زندگی کا دائرہ تنگ کیا گیا، انہیں شک کی نظر سے دیکھا گیا۔ اا ستمبر کا واقعہ امریکی تاریخ کا سب سے خوفناک واقعہ ہے۔ اس دن دنیا کی سپر پاور امریکہ میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے نہ صرف امریکہ بلکہ پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس حملے کے باعث نہ صرف امریکی معاشی بحران کا شکار ہوئے بلکہ بہت سی قیمتی جانیں اس کی نذر ہو گئیں۔ اس حملے میں بہت سے مسلمان بھی شہید ہوئے لیکن پھر بھی تمام الزام

مسلمانوں کے حصے میں آیا۔ اسامہ بن لادن اور اس کی تنظیم االقاعدہ کو اس حملے کا ذمہ دار قرار دے کر مسلمانوں پر زندگی کا دائرہ تنگ کر دیا گیا۔ ان کی شناخت کو مشکوک بنادیا گیا۔ مسلمانوں کو دنیا کی نظر میں دہشت گرد اور مذہب اسلام جنونیت پسند اور شدت پسند بنادیا گیا۔ اسی ایک حملے کو بنیاد بنا کر امریکیوں نے مسلمانوں کو ظلم وستم کا نشانہ بنایا۔

مسلمانوں کے خلاف امریکیوں کی اس نفرت کا ان کی قیادت نے بھی خوب فائدہ اٹھایا۔ اور مسلم ممالک کو جبر کا نشانہ بنایا۔

امریکہ ایک ایسا ملک ہے جہاں انسانوں اور خصوصاً مسلمانوں کو کم حیثیت مانا جاتا ہے، انہیں حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، انہیں اہمیت نہیں دی جاتی۔

> امریکی ایک منظم اور زیادہ مدت تک جذبات میں نہ بہنے والی قوم ہیں وہ اس کا ماتم کرنے کے بعد اپنے صدمے سے باہر آگئے لیکن ان کی قیادت انہیں مسلسل اس صدمے میں دھکیلتی رہی یہاں تک کہ بش ایسے معمولی قابلیت کے شخص نے بھی دہشت گردی کا سیاہ پرچم بلند کر کے امریکہ کو مظلوم ثابت کر کے دوبارہ صدارت حاصل کر لی۔۔۔ اس المیے کی آڑ میں افغانستان اور عراق کو برباد کر دیا اور انہیں امریکیوں کو دہشت گردی کے خلاف جنگ کی ایک ایسی ڈھال مل گئی جس کی اوٹ سے وہ دنیا کی کسی بھی قوم یا فرد پر وار کر سکتے تھے۔۔۔[۵]

اسی واقعہ کو بنیاد بنا کر امریکہ نے دنیا کے ہر خطے میں موجود مسلمانوں کو جبر وستم کا نشانہ بنایا اور اپنا تاثر ایسا بنایا کہ جیسے وہ دہشت گردی جیسی عفریت سے مقابلہ کر کے دنیا کو اس سے نجات دلا رہا ہے، مگر حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے در اصل اس واقعہ کو بنیاد بنا کر امریکہ پوری دنیا کو اپنے زیر تسلط کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

> گیارہ ستمبر اور اسامہ کی داستانوں نے اسے وہ قوت دی کہ وہ مزید مستحکم ہو گیا۔۔۔ یہ امریکہ کی شاطر دانشمندی کا کمال ہے۔۔۔[۶]

اسی دہشت گردی کو ختم کرنے کے بہانے امریکہ عراقیوں پر اور دوسرے ممالک میں رہنے والے مسلمانو ں پر ظلم ڈھا رہا ہے۔ وہ کوڑے کے ڈھیر پر پڑے کتے کے بچے کو تو قابلِ رحم سمجھیں گے مگر عراقی بچے کو نہیں کیونکہ

ان کی نظر میں عراقی بچے پیدائش کے ساتھ ان کے لیے خطرے کا سبب ہیں۔ اس معصوم بچے کو بھی دہشت گرد قرار دے کر بے دردی سے مار دیا جاتا ہے۔

۱۱ ستمبر کے واقعہ کے بعد مسلمانوں کو جس طرح بے جا تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور انہیں اپنی شناخت کے لیے ایک جنگ لڑنی پڑی، اسی حوالے سے ڈاکٹر شیراز دستی نے *ساسا* کے نام سے ایک ایسا ناول تحریر کیا جس میں اس حادثے کے بعد والی دنیا کی صورتحال پیش کی گئی ہے۔ اس ناول میں پیار، محبت، ۹/۱۱ کے بعد مسلمانوں کے لیے دنیا کا ایک نیا انداز، حب الوطنی، امریکیوں کا ہر طرف چھا جانا، اپنی تہذیب و ثقافت کی برتری زور زبردستی کے تحت مسلط کرنا، مشرق اور مغرب کی تقسیم، مادیت پسندی، ثقافتی اختلافات، آفاقیت، تیسری دنیا کے مظلوم ممالک، سپر پاور کی جبریت، مرکزیت حاصل کرنے کی ایک جنگ جیسے موضوعات کہانی، کرداروں اور جملوں کے ذریعے ناول میں پیش کیے گئے ہیں۔

اس ناول کا مرکزی کردار سلیم شناخت کے بحران جیسے مسئلے کا شکار نظر آتا ہے۔ وہ جب امریکہ میں موجود ہے تو اسے یہ سوچ پریشان رکھتی ہے کہ وہ کون ہے؟ اور اپنی بنیادوں کو چھوڑ کر یہاں کیوں موجود ہے؟ وہ کیوں کسی دوسری ثقافت کے مطابق زندگی گزارنے پر مجبور ہے؟ وہ امریکہ میں بیٹھ کر بھی ہر لمحے اپنی اصل تہذیب و ثقافت کو یاد کرتا ہے۔ ان کے اس ناول میں مختلف تہذیب و تمدن کا موازنہ بھی ہے، انسانیت کا ایک نوحہ بھی اور تیسری دنیا کے باشندوں کی بے بسی کی تصویر بھی۔

اس ناول کے حوالے سے ڈاکٹر ناصر عباس نیر کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ساسا کا تھیم وہی ہے جسے ہم دنیا کے اکثر بڑے ناولوں میں دیکھتے ہیں یعنی تلاش۔۔۔۔ بظاہر یہ ایک عام سی کہانی ہے اور سلیم کا یہ سفر دائرے کا ہے۔ مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہے، محبت کی تلاش سلیم کو معاصر زندگی کی سب چھوٹی بڑی سیاسی، ثقافتی، میڈیائی حقیقتوں سے متعارف کرواتی ہے۔ کس طرح نا بعد گیارہ ستمبر دنیا میں سب پاکستانی شناخت کی سیاست کا شکار ہوتے ہیں اور ان جرائم میں ملوث سمجھے جانے لگتے ہیں جو انہوں نے کیے ہی نہیں۔۔۔۔[۶]

اپنے اس ظلم کے حق میں امریکیوں کے پاس گیارہ ستمبر والے واقعہ کی صورت میں ایک ٹھوس جواز موجود ہے۔ مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے ان مظالم کے پس پردہ محرکات میں ایک محرک یہ بھی ہے کہ امریکی دراصل

مذہب اسلام کے پیروکاروں کی تعداد میں کمی لانا چاہتے ہیں۔ کیونکہ یہ مذہب ایک ایسا مذہب ہے جسے کے ماننے والے کسی زور زبردستی کے تحت اس کو اپنانے پر مجبور نہیں ہوئے بلکہ اس کی تعلیمات سے متاثر ہو کر انہوں نے اس کو اس کو اپنی زندگی کا حصہ بنایا۔ امریکی مذہب اسلام کے اسی پہلو سے زیادہ خوفزدہ ہیں۔

> It is the west, a different civilization whose people Are convinced of the universality of their culture and believe that their superior, if declining power Imposes on them the obligation to extend that culture Throughout the world. They are the basic ingredients That fuel conflict between Islam and West.[۸]

یعنی مغرب کے لیے اصل خطرہ بنیاد پرستی نہیں بلکہ اسلام ہے۔ اسلام کے لیے اصل مسئلہ سی۔ آئی۔ اے یا امریکی محکمہ دفاع نہیں بلکہ مغرب ہے۔ مغرب کو اپنی تہذیب کی برتری اور آفاقیت پر بڑا گھمنڈ ہے اور وہ اس تہذیب کو ساری دنیا پر مسلط کر دینا چاہتا ہے۔ اصل میں یہی اجزائے ترکیبی اسلام اور مغرب کے درمیان اصل تصادم کا ایندھن ہیں۔

پروفیسر خورشید احمد کی رائے میں مغرب کو اسلام اور احیائے اسلام سے خطرہ نہیں ہونا چاہیے کیونکہ:

> It is a movement that allows Muslims to go Back to their roots intellectually, morally, Culturally, and Ideologically.[۹]

یعنی اسلام کا مقصد کبھی کسی تہذیب کے ساتھ تصادم ہرگز نہیں رہا۔ تہذیبی تصادم غیر اسلامی تہذیبوں کا مقصد رہا ہے۔

اسی طرح ماضی میں امریکہ جیسے ملک میں یہودیوں کے ساتھ بھی کچھ زیادہ اچھا سلوک نہیں کیا گیا۔ انہیں بھی ہر طرح کی حقارت کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر اب یہی یہودی اپنی صلاحیتوں کی بنا پر پورے امریکہ پر قبضہ کیے ہوئے ہیں۔ چاہے وہ امریکی معیشت ہو یا عام زندگی، سب جگہوں پر یہودی اپنی صلاحیتوں کی بنا پر ایک قابل عزت مقام پر پہنچ چکے ہیں۔ اور ایسا صرف اس لیے ہوا کہ یہودیوں نے امریکیوں کے طنز و حقارت بھرے سلوک سے دلبر داشتہ ہو

کر اپنے اوپر زندگی کو خود ساختہ انداز میں ختم نہیں کیا بلکہ اپنے اندر ایسی صلاحیت اور قابلیت پیدا کی کہ آج وہ اس جگہ پر اپنی قابلیت کا لوہا منوا چکے ہیں جہاں کبھی ان پر زندگی کا دائرہ تنگ تھا۔

نیو یارک ایک ایسا شہر ہے جہاں زیادہ تر کاروباری معاملات میں یہودی چھائے ہوئے ہیں۔ بقول مصنف:

> نیو یارک کو جیو یارک بھی کہا جاتا ہے کہ اس شہر میں زرد شیطان کے جتنے سنہری معبد ہیں۔۔۔ جہاں سونے کی ڈالیاں آبشاروں کی برستی ہیں۔۔۔۔۔ بین الاقوامی کاروبار، صورت بینک، جائیدادیں، میڈیا۔۔۔۔۔ ان سب پر یہودی حاوی ہیں اور بے وجہ حاوی نہیں ہیں، ان میں اتنی اہلیت ہے کہ وہ اقلیت ہونے کے باوجود اکثریت پر چھائے ہوئے ہیں۔۔۔۔۔۔ [۷۱]

یہودی اقلیت میں ہونے کے باوجود اتنی قابلیت رکھتے ہیں کہ وہ نیو یارک میں اپنی آزادی سے زندگی گزار سکتے ہیں۔

جب کسی ملک میں ایک خاص عقیدے کو ماننے والے دوسرے مذہب کے ماننے والوں کے عقیدے کا احترام کرنے کی بجائے ان پر تنقید شروع کر دیں تو اس وجہ سے پیدا ہونے والے تہذیبی تصادمات کی نوعیت بھی قدرے مختلف ہوتی ہے۔ کیونکہ مذہب ایک ایسا موضوع ہے جس پر بات کرتے ہوئے سبھی حساس ہو جاتے ہیں۔ امریکہ میں مصنف کی ملاقات جب ایک یہودی سے ہوئی تو پہلے تو بات چیت ٹھیک چلتی رہی مگر جب بات عقیدے کے حوالے سے شروع ہونے لگی تو مصنف نے خود اس حوالے سے بحث کرنے سے اجتناب کیا تاکہ بات زیادہ خراب نہ ہو۔ پہلی دفعہ جب یہودی سے بات کرتے ہوئے اس یہودی نے ان کے عقیدے پر بات کی اس وقت تو مصنف نے کچھ نہ کہا مگر جب دوسری دفعہ اس یہودی نے وہی بات دہرائی تو مصنف نے اسے ٹوک دیا۔ اور یہ اس وقت ہوا جب مصنف نے ان کی عبادت کے مقررہ وقت کے متعلق بات کی اور اس میں شامل ہونے کی اجازت چاہی تو جواب میں یہودی نے کچھ ایسا انداز اختیار کیا:

> کیا میں آپ کی عبادت میں شامل ہو کر یہ جان سکتا ہوں کہ آپ خدا کو کیسے یاد کرتے ہیں۔۔" "ہاں ۔۔۔ کیوں نہیں۔۔ آپ ہم میں سے ہی ہیں۔۔۔ اگرچہ بھٹکے ہوئے ہیں۔۔۔" ہرمن نے بھٹکے ہوئے والا فقرہ دوسری بار کہا تھا۔۔۔ پہلی بار تو میں ضبط کر گیا تھا۔۔۔ لیکن اب کی بار ضبط کا یہ دامن

چھوٹ گیا" یہ بحث نہ چھیڑیئے کہ ہم میں سے بھٹکا ہوا کون ہے۔۔۔ آپ یا ہم۔۔۔نہ آپ ہمارا دل دکھایئے اور نہ ہم آپ کو ٹھیس پہنچاتے ہیں۔۔۔۔۔[11]

اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو کسی دوسرے عقیدے کے ماننے والوں پر طنز کرنے کی اجازت ہر گز نہیں دیتا اور نہ ہی زور زبردستی کے تحت اپنا دین پھیلانے کا حکم دیتا ہے۔

یہودی خاص طور پر خوراک وغیرہ کے معاملے میں بہت اصول پسند اور احتیاط پسند واقع ہوتے ہیں۔ نیویارک جیسے شہر میں جہاں حلال اور حرام کی تمیز کرنا بہت مشکل کام ہے اس معاملے میں یہودی بہت خیال کرتے ہیں اس چیز کے لیے انہوں نے ایک کمیٹی بھی بنا رکھی ہے۔ جو سخت قوانین کے تحت چیزوں کے حلال یا حرام ہونے کا فیصلہ کرتی ہے۔ یہاں تک کہ یہ کمیٹی کھانے پینے کی چیزوں سے لے کر ٹوتھ پیسٹ کی تیاری میں بھی اس چیز کو یقینی بناتی ہے کہ کہیں اس میں کسی حرام جانور کی چربی وغیرہ کا استعمال تو نہیں کیا جارہا۔

یہودی جو امریکہ جیسے ملک میں بھی اپنے قوانین کے تحت کچھ حد تک آزادانہ زندگی گزار رہے ہیں۔ کاروباری معاملات اور دیگر مقامات پر چھا چکے ہیں وہ بھی امریکیوں کی اس تعصب پسندی کا شکار ہو جاتے ہیں جس میں وہ دوسرے مذاہب سے تعلق رکھنے والوں کو ظلم اور حقارت کا نشانہ بناتے ہیں۔

مذہب میں فرق کی بنا پر یہودیوں کو بہت سی جگہوں پر ظلم کا نشانہ بھی بنایا گیا، انہیں ہر ملک سے خارج کیا گیا۔ اس کی کچھ وجوہات مصنف کے نزدیک یہ ہیں:

> اُن میں ایک در پردہ تکبر یا فخر تو تھا اور اب بھی ہے کہ صرف ہم ہی خدا کے چنے ہوئے پسندیدہ قبیلے کے فرد ہیں۔۔۔ یہ عیسائی یا مسلمان وغیرہ تو بہت بعد کی باتیں ہیں انہوں نے ہم سے خوشہ چینی کر کے الگ مذہب بنا لیے۔۔۔۔ ہم جیسا اور کوئی نہیں۔۔۔ اسی لیے ان کی وفاداریوں پر ہمیشہ شک کیا گیا۔۔۔ یہ احساسِ برتری اور دوسروں کو حقیر سمجھنا بھی ان پر ڈھائے جانے والے مظالم کا ایک سبب تھا۔۔۔[12]

امریکہ اور یورپ جو خود کو بہت تہذیب یافتہ سمجھتے ہیں وہاں بھی مذہب کی بنا پر یہودیوں کو حقارت کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ یہودی بہترین مقام حاصل کرنے کے لیے بہت محنت کرتے ہیں کہا یہ جاتا ہے کہ اگر تم کسی جینئس سے ملو تو اس سے یہ دریافت کرنے کی ضرورت نہیں کہ تم کون ہو۔۔۔ وہ اکثر یہودی ہو گا۔

اپنی بقا کے لیے یہودیوں نے خوب محنت کی، کاروبار، فنونِ لطیفہ، سائنس اور فلسفے میں بھی اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑنے لگے۔ لیکن اس محنت اور کامیابی کے باوجود بھی:

> ایک یہودی کے پاس انتخاب کا اختیار بہت محدود تھا۔۔۔ وہ ایک شاہی خاندان کا فرد نہیں ہو سکتا تھا۔۔۔ ایک شہزادہ یا دشاہ نہیں ہو سکتا تھا۔۔ آج تک ایسا نہیں ہوا۔۔۔ وہ سیاست میں یا فوج میں آخری عہدے پر نہیں پہنچ سکتا تھا۔۔۔ انتظامیہ میں بھی اگر وہ بے پناہ صلاحیت رکھتا ہو تو بھی چند سیڑھیاں اوپر جا سکتا ہے، آخر تک نہیں جا سکتا۔۔۔ چنانچہ اس کے انتخاب کا اختیار بہت محدود ہو جاتا ہے۔۔۔ صرف چند راستے کھلے ہیں۔۔۔ کاروبار، سائنس، تحقیق اور فنونِ لطیفہ۔۔۔ [۳۱]

گویا اپنے آپ کو آزاد کہنے والی ریاست میں بھی لوگوں کو ان کی ذہنی آزادی کے ساتھ رہنے کی اجازت نہیں ہے۔ مذہب میں فرق کی بنا پر وہ اپنی تمام تر صلاحیتوں کے ساتھ بھی پیچھے دھکیل دیا جاتا ہے۔ انہیں کبھی امریکیوں سے آگے آنے کا حق نہیں دیا جاتا۔

محض یہودی ہونے کی بنا پر اکثر لوگوں کو ان کے جائز حقوق سے بھی محروم رکھا جاتا ہے۔ ایسی ہی صورتحال ایک خاتون پر بھی گزری جو روس کی بہترین محقق تھیں، انہیں غالب اور اقبال پر تحقیق کے حوالے، مجلس فروغ اردو ادب 'دوحہ' قطر کی جانب سے خصوصی ایوارڈ عطا کیا گیا۔ لیکن محض یہودیوں سے تعلق کی بنا پر اسے اس کی اعلیٰ تعلیم سے بھی محروم رکھا گیا۔

امریکی مذہب اسلام سے اس قدر خوفزدہ ہیں کہ وہ اس مذہب کے ماننے والوں کو ذہنی اذیت دینے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ گوانتاناموبے جیل میں مسلمانوں کے ساتھ جو ناروا سلوک رکھا جاتا ہے اس ظلم کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھائی جاتی اور اگر کوئی اس ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کی کوشش کرے تو بھی مسلمانوں کو مکار کہہ کر یعنی ان کی ذہنی اذیت کو محض مکاری کا نام دے کر خاموش کروا دیا جاتا ہے۔

ایک امریکی فوجی کیپٹن جسے شام بھیجا گیا تو وہ وہاں کے اخلاق اور نسلی برابری کے نظریے سے اتنا متاثر ہوا کہ مسلمان ہو گیا۔ اس کے ساتھ واپسی پر جو سلوک ائیر پورٹ پر کیا گیا وہ انتہائی ناروا تھا اور یہ سب اس لیے کیا گیا کیونکہ وہ مسلمان ہو چکا تھا۔ اس سلوک کی تفصیل اس سفر نامے میں کچھ اس انداز میں ملتی ہے۔

> ائیر پورٹ پر ایف بی آئی، اور فوج کے اداروں کے متعدد افسران میرے "استقبال" کو موجود تھے ۔۔۔ انھوں نے بار بار میرے سامان کی تلاشی لی۔۔۔ میرے کپڑے اتروا کر میرے بدن کو ٹٹولا گیا ۔۔ اور میں احتجاج کرتا رہا کہ ڈیم اٹ آئی ایم این آفیسر آف یو ایس آرمی۔۔۔ پر ان پر کچھ اثر نہ ہوا۔ مجھے تین روز تک قید میں رکھا گیا۔ مجھ پر غداری اور جاسوسی کا مقدمہ چلایا گیا۔۔ اگرچہ مجھے با عزت طور پر بری کر دیا گیا اور مجھ سے معذرت کی گئی لیکن انھوں نے میری روح کو داغدار کر دیا کہ میں اپنے ملک اور فوج کا اتنا ہی وفادار تھا جتنا کہ کوئی بھی شخص وفادار ہو سکتا ہے، صرف میں مسلمان تھا اس لیے میرے ساتھ یہ ہتک آمیز رویہ اختیار کیا گیا۔۔۔ [۱۴]

تہذیبوں کے اس تصادم سے ایک ملک فلسطین کے ختم ہونے کا ڈر ہے کیونکہ وہاں زبردستی قبضہ کر کے ان کی تہذیب و ثقافت کو ختم کیا جا رہا ہے۔ مصنف کے خیال میں یہودی کاروباری معاملات، لین دین کے معاملات میں عدل پسند لوگ ہیں۔ ان کی تاریخ کا سیاہ باب فلسطین پر زبردستی کا قبضہ ہے اس کے لیے بھی یورپیوں نے اسرائیلیوں کو مجبور کیا:

> یہودیوں کو بھی حق حاصل تھا کہ ان کا بھی اپنا ایک الگ وطن ہوتا۔۔ اور یہ یورپ کا فرض تھا کہ جس نے لاکھوں یہودیوں کو زندہ جلا کر راکھ کیا کہ وہ اپنے اس عظیم جرم کی تلافی کرتا اور انہیں کوئی سر زمین عطا کرتا۔۔۔۔ لیکن انھوں نے اپنی بلا فلسطینیوں کے گلے میں ڈال دی۔۔ ایک پوری قوم ایک ہزار برسوں سے مقیم نسل کو زبردستی بے گھر کر کے اسے خدا کے وعدے کا بہانہ بنا کر بے گھر کر کے پوری سرزمین پر یہودیوں کا تسلط قائم کر دیا۔۔۔ اور سوائے جرم ضعیفی کے ان فلسطینیوں کا کوئی دوش نہ تھا۔۔۔ گیس چیمبرز میں راکھ ہو جانے والے لاکھوں یہودیوں میں سے کسی ایک کی موت کے ذمہ دار وہ نہیں تھے۔۔۔ یورپ تھا۔۔ [۱۵]

یہودی جو بہت سے معاملات میں خاصے عقل مند تھے وہ اس حوالے سے یورپ کے اس جال میں آ گئے اور اپنے اوپر ڈھائے گئے یورپی مظالم کا بدلہ فلسطین کی معصوم عوام سے لینے لگے۔ ان کی سرزمین کو "پرامسڈ لینڈ" کہہ کر

اس پر قبضہ کر لیا اور فلسطینی مسلمانوں پر بے انتہا مظالم ڈھائے۔ وہاں خوف اور دہشت پھیلائی۔ معصوم بچوں کو بھی دہشت گرد قرار دے کر بے دردی سے مار اگیا۔ اور اس ظلم پر عالمی برادری کی طرف سے کوئی آواز بھی نہیں اٹھائی جا رہی۔

> یورپ اور امریکہ تک تو ان کی موت کی خبر بھی نہ پہنچی کہ وہ تو ان کے وجود سے بے خبر تھے اور اگر خبر پہنچ جاتی تو وہ ایک صاف ضمیر کے ساتھ انہیں دہشت گرد قرار دے کر بری الذمہ ہو جاتے کہ ایک اسرائیلی افسر کا یہ بیان تو میں نے خود سنا اور دیکھا ہے کہ اگر ہمارے ہاتھوں بچے ہلاک ہو جاتے ہیں تو اس پر احتجاج کرنے کی ضرورت نہیں کہ فلسطینی پیدا ہوتے ہی دہشت گرد ہو جاتے ہیں۔۔۔وہ ہمارے ٹینکوں پر پتھر پھینکتے ہیں۔۔۔ اس لیے وہ بھی جائز نشانہ ہیں۔۔۔۔۔[۱۶]

مغربی تہذیب ہر طرح سے اسلامی تہذیب کو کمزور کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ مغرب اپنی اقدار و روایات اور مذہب و ثقافت کو دوسری تہذیبوں میں رائج کر کے اپنا علم پوری دنیا میں پھیلانے کا خواہاں ہے۔ اس کا سب سے بڑا ہدف اسلامی تہذیب ہے۔ مغرب نے ہمیشہ پورے عالم اسلام کو اپنے ماتحت کرنے کی کوشش کی ہے۔

اقوام متحدہ نے بھی ہمیشہ مغربی اتحادیوں اور امریکی مفادات کو سراہا ہے۔ اسرائیل اور امریکہ کے مظالم کے خلاف آواز اٹھانے والے ممالک کو ہمیشہ فراموش کیا گیا ہے۔ مغربی تہذیب کو ہمیشہ آفاقی تہذیب تصور کیا جاتا رہا۔ جبکہ اس تہذیب نے اپنی ساکھ کو قائم کرنے کے لیے مشرقِ وسطیٰ اور دوسرے ممالک جو مغربی تہذیب سے الگ تہذیب و ثقافت رکھتے ہیں وہاں ظلم و بربریت کی جنگ شروع کی ہوئی ہے اور اس سے تہذیبی تصادم بڑھتا جا رہا ہے۔

امریکی تہذیب دراصل اسلامی تہذیب کو اپنا غلام بنانا چاہتی ہے۔ تا کہ دنیا میں اس کی اجارہ داری قائم ہو سکے اور دوسری تہذیبوں کو وہ اپنی طاقت کے بل پر مفلوج کر سکے۔ یہ قانونِ قدرت ہے کہ ہر عروج کے بعد زوال آتا ہے۔ تہذیبوں کے درمیان بھی عروج و زوال آتا رہتا ہے۔ آج اپنے آپ کو منوانے کی جس خواہش کا اظہار امریکی تہذیب کر رہی ہے اس سے پہلی یونانی تہذیب اور کئی دیگر تہذیبیں بھی ایسا کر چکی ہیں اور نتیجہ ہمارے سامنے ہے کہ آج ان تہذیبوں کے نام ہمیں صرف تاریخ کے اوراق میں ہی نظر آتے ہیں۔ مغربی تہذیب جس کی پشت

پناہی امریکہ کر رہا ہے اس کا انجام بھی کچھ ایسا ہی ہونے والا ہے۔ لیکن پھر بھی مغربی تہذیب دوسری تہذیبوں کو کمزور کرنے اور ان پر اپنی اجارہ داری قائم کرنے کی کوششوں میں ہے۔ معید الظفر لکھتے ہیں:

> مغربی تہذیب جس کی نمائندگی موجودہ دور میں امریکہ کر رہا ہے اس قانون قدرت کے خلاف جاکر اپنی بالادستی و برتری کو محفوظ کرنا چاہتی ہے جو باالفاظ دیگر زمانے کی گردش کو روکنے کے مترادف ہے۔[127]

مغربی تہذیب انسانی تمدن کے ارتقا کی ایک شکل ہے جو جمہوریت اور سیکولرازم کی آغوش میں لپٹی ہوئی ایمانی اور روحانی اقدار سے نابلد ہے۔ مغرب کو کلیسا کی غیر حکیمانہ سوچ اور نفرت نے روحِ مذہب سے دور کر رکھا ہے یہاں تک کہ یہ انسانی فطرت کا ناگزیر تقاضا ہے۔ مغرب مادّی ارتقا کے ساتھ اخلاقی نشوونما کے تقاضوں کو ہم آہنگ نہیں رکھ سکا ہے۔ اس کے ہاں مذہب سے انحراف کی وجوہ واضح ہیں۔ اس کا فکری تضاد یہ ہے کہ وہ عالمگیریت پر یقین رکھتا ہے مگر انسانوں اور معاشروں کی سیاسی، سماجی، اقتصادی اور معاشرتی تقسیم پر کاربند ہے۔ مغربی دانشوروں کو جلد یہ حقیقت معلوم ہو جائے گی کہ موجودہ صورتحال تہذیبوں کا نہیں بلکہ مفادات کا تصادم ہے۔

مغربی تہذیب کی بنیاد مادی ترقی اور شخصی آزادی پر رکھی گئی ہے۔ امریکہ میں شخصی آزادی سے وہ تمام پابندیاں ہٹ گئیں جن میں ایک تہذیب انسان کو باندھتی ہے جس کی وجہ سے تمام معاشرہ تنہائی اور اضطراب کا شکار ہوتا جا رہا ہے۔

اس کے مقابلے میں مشرق کو جاہل اور ناعاقبت اندیش سمجھا جاتا ہے۔ ایک مشرقی آدمی اپنے مذہب اور اقدار کو نہیں چھوڑ سکتا۔ مشرق اور مغرب اس لیے نہیں مل سکتے کیوں کہ دونوں کا اندازِ فکر اور طرزِ زندگی بہت مختلف ہے۔

یہ ضروری ہے کہ تیسری دنیا کے باشندے اپنی شناخت ختم نہ کریں، اپنی تہذیب کو اعلیٰ سمجھیں اور ان اقدار کی قدر کریں جو مشرقی تہذیب کا خاصہ ہیں، جن پر عمل پیرا ہو کر ہم کامیابی و کامرانی حاصل کر سکتے ہیں۔

مسلمان اپنا شاندار ماضی فراموش کر چکے ہیں۔ وہ مسلمان جنہوں نے جدید علوم کی بنیاد رکھی آج وہ اپنی نا اہلی کی وجہ سے پس ماندگی کا شکار ہیں۔ اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب میں تصادم سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ دیگر تہذیبوں اور خصوصاً اسلامی تہذیب پر مغربی تہذیب کی یلغار ہے اور اس یلغار کی ایک بڑی وجہ مغرب کی طاقتور معیشت بھی ہے اور مغربی معیشت کی یہ طاقت تیسری دنیا کے باشندوں کو اپنا اسیر بناتی جا رہی ہے اور انہیں اپنی تہذیب میں خامیاں نظر آتی ہیں۔

مغرب اب ایک ثقافتی عالمگیریت کا خواہش مند ہے یہ ثقافتی عالمگیریت ایک خطرناک پہلو ہے، کیونکہ ثقافت کا تعلق مذہب سے ہے۔ خصوصاً اسلامی تہذیب و تمدن، مذہب اسلام کی اساس ہے۔ اس لیے مغرب کی یہ کوشش ہے کہ وہ تمام تہذیبوں بشمول اسلامی تہذیب کو ختم کر کے صرف اپنی اس تہذیب کو تمام عالم پر مسلط کر دے جس کی کوئی بنیاد یا تاریخ ہی نہیں ہے۔ اس طرح وہ براہ راست مذہب پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔ اسی لیے مغرب کی ثقافتی عالمگیریت کی یہ خواہش دوسرے مذاہب کے خاتمے کی خواہش بھی کہی جا سکتی ہے۔ اور دوسرے مذاہب پر حملہ اہل مغرب کی طرف سے اسی انداز میں کیا جاتا ہے کہ وہ اس مذہب کے پیروکاروں کو ظلم و تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ اس عمل کے پس پردہ یہ محرکات بھی شامل ہیں کہ کسی طرح دنیا کے تمام مذاہب کا خاتمہ کر کے ان مذاہب کے پیروکاروں کو لادینیت کی طرف لایا جائے اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے وہ مختلف مذاہب کو، وہاں کی تہذیب و ثقافت کو ان کے پاؤں کی زنجیریں بنا کر پیش کرتے ہیں۔ ایسی زنجیریں جن سے آج کا انسان آزادی کا خواہش مند نظر آتا ہے۔

یوں تو اسلامی تہذیب بھی کم و بیش پوری دنیا میں پہنچی لیکن اس تہذیب کی خاص بات یہ ہے کہ اس تہذیب کو کبھی بھی کسی پر زبردستی مسلط نہیں کیا گیا بلکہ جو بھی اس تہذیب کا حصہ بنا وہ اس کی خصوصیات سے متاثر ہو کر اس میں شامل ہوا۔ لیکن سیکولر مغربی تہذیب جہاں بھی گئی اس نے تعلیم کے نام پر اپنی تہذیبی روایات کو پروان چڑھایا اور مقامی روایات و ثقافت کی حوصلہ شکنی کی، انہیں کمتر کہا گیا اور اپنے طرز بود و باش کو، اپنی تہذیب و ثقافت کو زبردستی دوسری اقوام پر مسلط کیا گیا جیسا نو آبادیاتی عہد میں کیا جاتا رہا ہے۔ جو علم و فکر سے مرعوب ہو سکا اسے اپنی حیرت انگیز ایجادات اور اپنی تعلیم سے ورطہ حیرت میں ڈالا، جو اس طرح دام میں نہ آ سکا اسے بندوق کے زور سے مرعوب کیا۔ چنانچہ ہر صورت اپنا تسلط دنیا پر قائم کرنے کی کوشش کی اور یہ سب کام انسانیت، جمہوریت، حقوق کی آگاہی اور آزادیٔ افکار کے نام پر کیا جاتا رہا۔

اسلام نے جس جمہوریت کا تصور دیا اس میں انسانوں کی رائے کو ان کی تعلیم اور تجربے کی بنیاد پر مقام دیا جاتا ہے۔ لیکن سیکولر مغربی تہذیب نے جو تصورِ جمہوریت دیا اس میں محض انسانوں کو گنا جاتا ہے، ان کی رائے اور اندازِ فکر کو وہ مقام و مرتبہ نہیں دیا جاتا جس کا وہ حق دار ہے۔ وہ مرتبہ اکثر نسلی امتیاز کے باعث بھی نہیں دیا جاتا۔

دنیا کی مختلف اقوام کے مابین تصادم کی وجوہات تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ کبھی یہ وجوہات سیاسی ہوتی ہیں اور کبھی اقتصادی۔ ہنٹنگٹن کا خیال ہے کہ آنے والے دنوں میں یہ تہذیبی ہوں گی۔ اسلام اس میں بطور فریق سب سے اہم ہے جو مغربی تہذیب کو چیلنج کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سیموئیل پی۔ ہنٹنگٹن، تہذیبوں کا تصادم مترجم احسن بٹ(لاہور: مثال پبلشنگ ۲۰۰۳ء)، ص۲۷۹۔

۲۔ سید عبدالواحد معینی(مرتب)،مقالاتِ اقبال(لاہور: شیخ محمد اشرف، ۱۹۶۳ء)، ص۳۹۔۴۰۔

۳۔ سیموئیل فلپس ہنٹنگٹن(Samuel. P Huntington)، *The Clash of Civilizations and Remaking of world order*،(نیویارک: سائمن اینڈ چیسٹر ۲۰۰۳ء)، ص۲۱۵۔

۴۔ منشی عبدالرحمن شوق امرتسری،قوم اور مذہب (امرتسر: پبلک بک ڈپو مسلم، س۔ن)، ص۶۔

۵۔ مستنصر حسین تارڑ،نیو یارک کے سو رنگ(لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز ۲۰۰۸ء)، ص۴۳۔

۶۔ ایضاً، ص۴۷۔

۷۔ محمد شیر از دستی،ساسا (لاہور: عکس پبلی کیشنز ۲۰۱۸ء)، ص۳۔

۸۔ سیموئیل فلپس ہنٹنگٹن(Samuel. P Huntington)، *The Clash of Civilizations and Remaking of world order*،(نیویارک: سائمن اینڈ چیسٹر، ۲۰۰۳ء)، ص۲۱۷۔۲۱۸۔

۹۔ ابراہیم ابوربی(Ibrahim M. Abu Rabi) (مرتب)، *Islamic Resurgence: Challenges, Directions and Future perspectives.*، (انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، ورلڈ اسلامک اسٹڈیز انٹرپرائز، ۱۹۹۵ء)، ص۲۶۔

۱۰۔ مستنصر حسین تارڑ،نیویارک کے سو رنگ(لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز ۲۰۰۸ء)، ص۳۱۸۔

۱۱۔ ایضاً، ص۳۰۰۔

۱۲۔ ایضاً، ص۳۲۲۔

۱۳۔ ایضاً، ص۳۲۵۔

۱۴۔ ایضاً، ص۵۳۸۔

۱۵۔ ایضاً، ص۳۲۹۔

۱۶۔ ایضاً، ص ۳۳۴۔

۱۷۔ معید الظفر، تہذیبی تصادم اور فکر اقبال (سرینگر: انسٹی ٹیوٹ آف کشمیر، ۲۰۰۴ء) ص ۶۷۔

باب چہارم:

سفر نامے میں مختلف معاشی اور سیاسی مفادات کی وجہ سے پیدا ہونے والے اختلافات کا تجزیاتی مطالعہ

باب چہارم:

سفر نامے میں مختلف معاشی اور سیاسی مفادات کی وجہ سے پیدا ہونے والے اختلافات کا تجزیاتی مطالعہ

جس وقت ایک ترقی پذیر ملک اپنی معیشت کو مضبوط بنانے، اور دوسرے ممالک پر اپنا بے جا تسلط قائم رکھنے کے لیے ایسے اقدامات کرتا ہے جو اس کے حق میں تو بہتر مگر دوسرے ممالک کے لیے نقصان دہ ہوتے ہیں، تو اس بنا پر بھی مختلف تہذیبوں کے درمیان اختلافات جنم لیتے ہیں۔ جیسے مغرب اپنی غالب حیثیت کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے مفادات کو "عالمی برادری کے مفادات" کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ اسی طرح کئی دوسری مغربی طاقتیں بھی اپنے مفاد کے لیے کیے گئے کاموں کا "عالمی" جواز مہیا کرتی ہیں۔

اسی طرح آئی۔ایم۔ ایف اور دوسرے بین الاقوامی معاشی اداروں کے ذریعے مغرب اپنے معاشی مفادات کو فروغ دیتا ہے اور دوسری قوموں پر وہ معاشی پالیسیاں نافذ کرواتا ہے جنہیں وہ خود درست سمجھتا ہے اور جو اس کے حق میں بہتر ہوتی ہیں۔

آئی۔ایم۔ایف کے بارے میں جارجی آربیٹو کا بیان ہے کہ:

> یہ دوسرے لوگوں کی دولت ضبط کرنے، غیر جمہوری اور عجیب معاشی وسیاسی ضابطوں کو نافذ کرنے اور معاشی آزادی کو سلب کرنے سے محبت کرتے ہیں۔[1]

بین الاقوامی مالیاتی فنڈ یا (آئی ایم ایف) انٹرنیشنل مونیٹری فنڈ (IMF) یک عالمی مالیاتی ادارہ ہے جو ملکی معیشتوں اور ان کی باہمی کارکردگی بالخصوص زر مبادلہ، بیرونی قرضہ جات پر نظر رکھتا ہے اور ان کی معاشی فلاح اور مالی خسارے سے نپٹنے کے لیے قرضے اور تیکنیکی معاونت فراہم کرتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے بہت سے یورپی ممالک کا توازن ادائیگی کا خسارہ پیدا ہو گیا تھا۔ ایسے ممالک کی مدد کرنے کے لیے یہ ادارہ وجود میں آیا۔ یہ ادارہ جنگ عظیم دوم کے بعد بریٹن وڈز کے معاہدہ کے تحت بین الاقوامی تجارت اور مالی لین دین کی ثالثی کے لیے دسمبر

۱۹۴۵ء میں قائم ہوا۔ اس کا مرکزی دفتر امریکہ کے دارالحکومت واشنگٹن میں ہے۔

بین الاقوامی مالیاتی فنڈ پر مکمل طور پر بڑی طاقتیں راج کر رہی ہیں جس کی وجہ اس کے فیصلوں کے لیے ووٹ ڈالنے کی غیر منصفانہ تقسیم ہے۔ یہ ادارہ تقریباً تمام ممالک کو قرضہ دیتا ہے جو ان ممالک کے بیرونی قرضہ میں شامل ہوتے ہیں۔ ان قرضوں کے ساتھ غریب ممالک کے اوپر کچھ شرائط بھی لگائی جاتی ہیں جن کے بارے میں ناقدین کا خیال ہے کہ یہ شرائط اکثر اوقات مقروض ملک کے معاشی حالات کو بہتر بنانے کی بجائے اسے بگاڑتے ہیں۔

مغرب کے دوہرے معیار کو اس طرح بھی دیکھا جا سکتا کہ وہ جمہوریت کو فروغ تو دیتے ہیں مگر اس جمہوریت کو نہیں جو بنیاد پرستوں کو اقتدار میں لائے۔ کیونکہ وہ بنیاد پرست حکمران مغرب کے اصول وضوابط کے تحت حکومت نہیں چلاتے اس لیے مغرب دوسرے ممالک کی صرف اس جمہوریت کو پسند کرتا ہے جو مغرب نواز حکومتوں کو اقتدار میں لائے۔ تاکہ وہ اسے اپنے انداز اور اصول وضوابط کے تحت چلا سکیں۔ اسی طرح ایران اور عراق کے لیے ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو روکنے کے احکامات جاری کیے جاتے ہیں لیکن اسرائیل کے لیے ایسے احکامات جاری نہیں ہوتے۔ اسی طرح انسانی حقوق صدام حسین کے معاملے میں تو یاد آتے ہیں مگر سعودی عرب کے حوالے سے نہیں۔

مغرب کا یہ ماننا تھا کہ انسانی حقوق کے مغربی تصورات اور سیاسی جمہوریت کی مغربی صورتیں ساری دنیا میں جلد ہی چھانے کو ہیں۔ لہٰذا مغرب والوں کا ترجیحی مقصد ہی جمہوریت کے اس پھیلاؤ کو فروغ دینا طے پا گیا، جس کے لیے مختلف سطحوں پر بہت سے عملی اقدام بھی کیے گئے۔ خارجہ پالیسیوں میں بھی مغربی جمہوریت کے پھیلاؤ کو شامل کیا گیا۔ قدرے کم درجے اور نسبتاً غیر واضح انداز میں انسانی حقوق اور جمہوریت کا فروغ یورپی ریاستوں کی خارجہ پالیسیوں میں بھی شامل ہو تا گیا نیز مغربی کنٹرول والے بین الاقوامی معاشی اداروں کے ترقی پذیر ملکوں کو دیئے جانے والے قرضوں اور گرانٹوں میں بھی۔

وہ مسائل جو مغرب اور دوسرے معاشروں کو تقسیم کر رہے ہیں، بین الاقوامی ایجنڈا پر رفتہ رفتہ بہت اہمیت اختیار کرتے چلے جارہے ہیں۔ ایسے تین مسائل جو مغرب کی کوششوں میں شامل ہیں کہ جن کی وجہ سے وہ اپنا تسلط قائم رکھ سکتا ہے درج ذیل ہیں:

۱۔ نیوکلیائی، حیاتیاتی اور کیمیائی ہتھیاروں کو دوسرے ملکوں میں روکنا اور خود ان ہتھیاروں کے پھینکنے کے ذرائع کی تیاری کے حوالے سے نئی پالیسیاں تشکیل دینا تاکہ وہ اپنی فوجی برتری کو برقرار رکھ سکے۔

۲۔ دوسرے معاشروں پر دباؤ ڈال کر مغرب کی سیاسی اقدار کو فروغ دینا۔ انسانی حقوق اور جمہوریت کو مغرب کی طرز پر قبول کرنے کے لیے دباؤ ڈالنا۔

۳۔ مغربی معاشروں کی ثقافتی، سماجی اور نسلی اتحاد و ارتباط کے تحفظ کے لیے غیر مغربی لوگوں کو بطور مہاجر داخلے پر پابندی لگانا۔

ان تین شعبوں میں مغرب کو غیر مغربی معاشروں کے مقابلے میں اپنے مفادات کے دفاع میں مسلسل دشواری کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اسی لیے مغرب ان چیزوں کو بین الاقوامی ایجنڈے کے طور پر تمام معاشروں پر زبردستی لاگو کروانا چاہتا ہے۔

فوجی استعداد کے پھیلاؤ سے عالمی معاشی اور سماجی ترقی ممکن ہو گی۔ جیسے ہی جاپان اور دیگر ایشیائی ممالک معاشی حوالے بہتری کی طرف گامزن ہوں گے وہ فوجی حوالے سے بھی طاقتور ہو جائیں گے۔ مغرب اسی معاشی ترقی سے خوفزدہ ہے کیونکہ کوئی بھی ملک جب معاشی لحاظ سے بہتر ہو جائے تو اپنا دفاع بھی مضبوط کر لیتا اور اپنی معاشی پالیسیوں میں کسی کو دخل اندازی کی اجازت بھی نہیں دیتا۔ مغربی سماج دراصل دولت کا پجاری ہے، جہاں اسے اپنے فائدے کی چیز نظر آتی ہے اسے طاقت کے بل بوتے پر زور زبردستی کے تحت یا ظلم سے چھین لیتا ہے۔ اس طاقت یا ظلم سے کسی دوسرے کو کیا نقصان پہنچتا ہے اس بات کا خیال دولت کا پجاری امریکی معاشرہ نہیں کرتا۔

امریکی سماج نے جمہوریت کے نام پر عوام کو حکمرانوں کے خلاف صف آرا کر دیا ہے۔ لیبر تنظیموں کے نام پر مزدوروں کو مل مالکان سے لڑوا دیا ہے۔ عوام میں فرائض کا شعور بیدار کرنے کی بجائے انہیں یہ درس دیا کہ حقوق مانگ کر نہیں چھین کر لیے جاتے ہیں۔ غرض معاشرے میں بے امنی اور بے سکونی کو فروغ دیا جا رہا ہے۔

مغرب کے نزدیک عالمگیر تہذیب سے مراد مغربی تہذیب ہے۔ عالمگیریت کے حوالے سے دیگر شعبوں میں مغربی اور امریکی اقدار کا غلبہ رہا ہے، یہاں تک کہ امریکی اقدار کے علاوہ دیگر رجحانات کی طرف نظر التفات بھی نہ کی گئی۔ سیاست کو امریکی مفاد کے مطابق ڈھالا گیا۔ جس طرح کا طرزِ جمہوریت امریکیوں نے کہا ویسا ہی اپنایا گیا۔ اقتصادیات کو امریکی ملٹی نیشنل کمپنیوں کی خواہشات کے مطابق تشکیل دیا گیا۔ عالمگیریت کے مفکرین کا کہنا ہے کہ عالمگیریت کی وجہ سے مغربی ممالک ترقی پذیر اور پسماندہ ممالک کا استحصال کر رہے ہیں۔ گلوبلائزیشن سے مغربی ممالک نے مشرقی دولت کو لوٹنا شروع کیا ہوا ہے جس سے مشرقی ممالک غریب سے غریب تر ہوتے جا رہے ہیں اور مغربی ممالک کی معیشت مستحکم ہوتی چلی جا رہی ہے۔ بقول معید الظفر:

> جہاں تک اس گلوبلائزیشن کا تعلق ہے اس نے نہ صرف معاشی اور سیاسی میدانوں کو متاثر کیا ہے بلکہ فن، ادب، ثقافت اور اسلامی تہذیب کو بھی سبوتاژ کرنے کی مذموم کوشش کی ہے۔[۲]

اور پھر جب ثقافت کی باری آئی تو فطری طور پر مغربی اور امریکی ثقافت ہی کو اقوام عالم پر مسلط کرنے کے لیے منتخب کیا گیا۔ اسی کو یہ حق دیا گیا کہ وہ پوری دنیا کی مشترکہ تہذیب بنے اور اسی کو اس لائق سمجھا گیا کہ وہ عالمی تمدن کی شکل اختیار کر لے۔ اس تمام صورتحال میں تیسری دنیا کے افراد کو مغربی تہذیب کی وہ شکل دکھائی گئی جو ہر لحاظ سے مکمل ہے، اس کے معاشی و سیاسی اور معاشرتی نظام میں موجود خامیوں پر پردہ ڈالا گیا۔ لیکن ایک سفرنامہ نگار جب کسی علاقے یا ملک میں جاتا ہے تو محض وہاں کے سیاحتی مقامات ہی کو نہیں دیکھتا بلکہ وہاں کی معاشی اور سیاسی صورتحال کو بھی جانچتا اور پرکھتا ہے۔ اسی طرح مستنصر حسین تارڑ نے بھی نیویارک جا کر وہاں کے صرف سیاحتی مقامات، میوزیم اور لائبریریاں ہی نہیں دیکھیں بلکہ اس ملک کی سیاسی اور معاشی صورتحال کی ابتری کو بھی دیکھا اور اسے اپنے سفرنامے کا موضوع بنایا۔

جیسے نیویارک جیسے شہر میں لوگوں کو کس حد تک کی بدترین معاشی تنگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس چیز کو مصنف نے اپنے سفرنامے کا حصہ بنایا کہ کس طرح ایک انسان نارمل اور خوشحال زندگی گزارتے گزارتے معاشی پریشانی کا شکار ہو سکتا ہے۔

> ایک انسان جو ایک زمانے میں معمول کی معزز اور نارمل زندگی گزارتے تھے۔۔۔ ملازمت کرتے تھے یا کاروبار کرتے تھے۔۔ آرام دہ گھروں میں رہائش کرتے تھے اور کسی بے گھر بھوکے کے آگے

رکھے ڈبے میں چند سکے ڈال دیتے تھے۔۔۔ پھر یہ ہوا کہ ایک صبح وہ شخص اپنے آفس جاتا ہے تو اسے ملازمت سے جواب مل جاتا ہے۔۔۔ کہ امریکہ میں ہائر اینڈ فائر کا اصول کارفرما ہے۔۔ ملازمت میں برخواستگی ایک ایسی تلوار ہے جو ہر لمحے ہر ملازم پر لٹکتی رہتی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔

آپ کو فائر کرنے کا کوئی جواز نہیں دیا جاتا۔۔۔۔ کوئی چارج شیٹ نہیں دی جاتی۔۔ قانونی چارہ جوئی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔۔۔ کاروبار میں بھی اسی نوعیت کے پل صراط ہوتے ہیں۔۔۔ بینک کے قرضے، ادھار کے کھاتے جن کے بل بوتے پر ایک کاروبار قائم ہے۔۔۔ یکدم وہ کاروبار کسی معاشی تبدیلی یا محض بدقسمتی کے باعث مسمار ہو جاتا ہے اور آپ ناک تک مقروض ہو جاتے ہیں۔۔۔ [۳]

نیویارک دراصل روپے پیسے کی دوڑ میں بھاگتے، بے حال ہوتے لوگوں کا شہر ہے۔ وہاں پر ملازمت پیشہ افراد یا کاروباری افراد کسی بھی لمحے ایک بہت بڑے معاشی مسئلے کا شکار ہو سکتے ہیں، اس چیز کا انہیں اندازہ بھی نہیں ہوتا۔ وہاں لوگوں کی زندگی قرضوں میں جکڑی ہوئی ہے، جہاں گھر سے لے کر گھاس کاٹنے والی مشین، صوفہ وغیرہ سبھی کچھ قسطوں پر لیا ہوتا ہے۔ اس صورت حال میں اگر کاروبار یا نوکری ختم ہو جائے تو شدید قسم کا ذہنی انتشار جنم لیتا ہے۔ جو اکثر لوگوں کو ان کی زندگی تک ختم کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

یہ وہ مسائل ہیں جن پر اہل مغرب نے تو پردہ ڈال رکھا ہوتا ہے مگر جب کسی دوسرے معاشرے کا ایک حساس فرد اس فضا میں سانس لیتا ہے، اس جگہ پر موجود دیگر چیزوں کا بغور مشاہدہ کرتا ہے، وہاں کی پالیسیاں دیکھتا ہے تو اسے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں ظاہر میں جو کچھ دکھایا جا رہا ہوتا ہے حقیقت اس سے مختلف ہے۔ بظاہر تو ایک پر سکون اور خوشحال معاشرہ دکھایا جاتا ہے جہاں روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں، جہاں کسی قسم کی کوئی پریشانی اپنا وجود نہیں رکھتی۔ لیکن حقیقت اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہاں انسان ہر لمحے ایک ذہنی پریشانی میں مبتلا نظر آتا ہے۔

بظاہر تو مغربی تہذیب و ثقافت اور معاشی و سیاسی پالیسیاں سب سے بہترین دکھائی جاتی ہیں کہ جیسے یہ پالیسیاں تمام دنیا کی بھلائی چاہتی ہیں اور دنیا کی ترقی صرف اسی میں ہے کہ وہ امریکی معاشی پالیسیوں پر عمل کرنا شروع کر دے جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ مغرب کی پالیسیاں تمام دنیا کی ترقی اور بھلائی کے لیے نہیں بلکہ صرف اور صرف اہل مغرب کی بہتری اور ترقی کے لیے بنائی جاتی ہیں۔ جیسے آئی۔ ایم۔ ایف بظاہر ایک ایسا ادارہ ہے جو معاشی پریشانی کے شکار ممالک کو اس وقت مدد فراہم کرتا ہے جب ان کی معیشت عدم استحکام کا شکار ہوتی ہے۔ لیکن اس مدد

کے پس پردہ ایسی معاشی پالیسیاں اس ملک میں رائج کروائی جاتی ہیں جو اس ادارے کے مقاصد کا تحفظ کریں نہ کہ گرتی ہوئی معیشت کو سہارا دیں۔ ایسا کر کے دراصل وہ تمام دنیا کو اپنے زیر تسلط دیکھنے کا خواب پورا کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے وہ ایسی پالیسیاں تشکیل دیتا ہے کہ جو ملک ایک دفعہ ان کے چنگل میں پھنس جائے اس کا نکلنا قریب قریب ناممکن ہے۔

امریکی اپنے مفاد کے لیے دوسرے ممالک میں اپنی پسند کی پالیسیاں لاگو کرواتے ہیں اور ان من مانی پالیسیوں کا اثر دوسرے ممالک کی معیشت پر کیا ہوتا ہے اس کا اظہار ہمیں مصنف کی اس تحریر میں نظر آتا ہے۔ پاکستان کا ایک شہری جب ان تمام چیزوں کا بغور مشاہدہ کرتا ہے تو اس دکھ کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے:

> نیویارک اسٹاک ایکسچینج ایک اور امریکی خدا ہے جو دنیا بھر کی معیشت کے فیصلے کرتا ہے۔۔۔ ہم جیسو ں کی قسمت کے فیصلے بھی آسمانوں پر نہیں یہاں ہوتے ہیں۔ یہاں سے ڈور ہلتی ہے تو ہمارے ہاں پٹرول مہنگا ہو جاتا ہے۔۔۔ ڈبل روٹی کی قیمت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور آٹے کا تھیلا ہمارے بس سے باہر ہو جاتا ہے۔[۲۷]

مغربی تہذیب نے تمام اقوام کو ذہنی غلام بنا دیا ہے۔ پوری دنیا کے وسائل کو ہتھیانے کے لیے سود پر مبنی استحصالی معاشی نظام کے ذریعے اس سیکولر مغربی تہذیب کا عالمی مالیاتی غلامی کا نظام مسلط کر رکھا ہے۔ جس میں تمام ممالک کے ہاتھ، پاؤں اور گردنیں بری طرح جکڑ دی گئی ہیں۔

اپنی کتاب میں ہنٹنگٹن مستقبل کے ممکنہ تہذیبی ٹکراؤ کی پیشن گوئی کو زیر بحث لاتے ہیں۔ ان کے مطابق چائنیز اور اسلامی تہذیبوں کا اتحاد اپنے "مشترکہ دشمن" یعنی مغربی تہذیب کے خلاف جلد یا بدیر ممکن ہے۔ اُن کے مطابق کئی ایک عناصر مثلاً مغربی اقوام کی غیر مغربی اقوام کے خلاف عسکری دباؤ کے ذریعے، اسلحے کا عدم پھیلاؤ جیسی ڈبل سیاسی پالیسی (خود تو اسلحہ بنایا بھی جا رہا ہے اور خرید بھی رہے ہیں جبکہ دیگر ممالک کے لیے اس پر پابندی لگا دی گئی ہے) یا مخالف سیاسی اقوام پر وحشیانہ جنگی کاروائیوں کے باوجود، انسانی حقوق کے علمبردار ہونے کے محض نعرے، اور تیسری دنیا کے کمزور ممالک میں آمرانہ یا مرضی کی ڈیموکریٹک ریاستوں یا سیاسی و اقتصادی فوائد کی خاطر اسلامی بادشاہوں کی اندرون خانہ حمایت اور مغربی ریاستوں میں غیر مغربی ممالک سے ہجرت کی حوصلہ شکنی یہ وہ تمام عوامل ہیں جو مغربی اقوام کے غالبانہ اقدام کو ثابت کرتے ہیں اور مغربی تہذیب کو رد کرنے کا جواز پیدا کرتے ہیں۔

امریکہ اور ایران کی کشیدگی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ ایرانی القدس فورس کے سربراہ جنرل قاسم سلیمانی کی ہلاکت واضح طور پر امریکی جارحیت کا ثبوت ہے۔ امریکہ نے ڈرون حملے کے ذریعے یہ قدم اٹھاکر واضح انداز میں یہ پیغام دیا ہے کہ اسے عالمی قوانین، ضابطوں اور معاہدوں کی رتی بھر بھی پرواہ نہیں ہے۔ وہ جہاں اور جیسے چاہے گا اپنے سامراجی مفادات کے حصول کے لیے طاقت کا بے دریغ استعمال کرے گا۔ اسے کوئی پرواہ نہیں کہ اس کے ان اقدامات کے نتیجے میں کوئی ملک یا خطہ کس حد تک عدم استحکام کا شکار ہو رہا ہے۔ زبردستی مسلط کی گئی جنگ کس حد نقصانات کی وجہ بنتی ہے اسے ان سب چیزوں کی بالکل بھی فکر نہیں ہے۔ انسانیت، تہذیب، ترقی، جمہوریت، انسانی وقار اور عظمت، انسانی حقوق اور زندہ رہنے کا حق وغیرہ یہ سب امریکہ کی جانب سے بلند کیے گئے محض نعرے ہیں۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ امریکہ ان تمام نعروں کو بھی اپنے مفادات کے حصول کے لیے استعمال کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ نے دنیا میں سب سے زیادہ عدم استحکام پیدا کیا ہے۔ جنگیں مسلط کی ہیں۔ مذہبی، فرقہ وارانہ، نسلی اور دیگر تعصبات کو استعمال کرکے مختلف ممالک اور اان کی تہذیبوں کو تاراج کیا ہے۔ یہ سب کچھ امریکہ نے دنیا پر اپنا تسلط اور غلبہ برقرار رکھنے کے لیے کیا۔ امریکی اقدامات اور پالیسیاں دنیا میں عدم استحکام پھیلانے کی سب سے بڑی وجہ ہیں۔ کبھی جمہوریت اور کبھی آمریت کی حمایت کرکے امریکی حکمران اپنے مفادات کا تحفظ کرتے رہے ہیں۔

جنرل سلیمانی کا قتل بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس قتل کے پیچھے دو امریکی مقاصد واضح نظر آتے ہیں۔ جنرل سلیمانی کا مشرقِ وسطیٰ میں امریکی مفادات کے خلاف مزاحمت کو منظم کرنے اور ایران کی حامی مسلح قوتوں کو مضبوط کرنے میں اہم کردار رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ شام میں بشارالاسد کی حکومت کو بچانے اور امریکہ کی حامی قوتوں کے خلاف کامیاب مزاحمت کو منظم کرنے میں بھی جنرل سلیمانی نے نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ ایک ایسا انسان جو امریکی مفادات کی راہ میں رکاوٹ بن رہا ہو اس کو راستے سے ہٹانا امریکیوں کے لیے بہت ضروری تھا۔

امریکیوں کا یہ خاص انداز ہے کہ جہاں حکومت بدلنی ہو اپنی پسند کے حکمران لانے ہوں وہاں سیاسی عدم استحکام پیدا کیا جائے۔ معاشی بحران پیدا کیا جائے۔ کیونکہ جب تک کسی ملک میں سیاسی عدم استحکام رہے گا وہاں کا معاشی نظام کبھی مضبوط نہیں ہو سکتا۔ اقتصادی پابندیاں عائد کرنا، معاشی سبوتاژ اور بحران امریکہ کی پالیسی کا حصہ ہیں۔ اس وقت ایران کے لیے امریکہ نے ایسی ہی صورتحال پیدا کر رکھی ہے کیونکہ وہ ایران میں ایسی حکومت لانا چاہتا ہے جو اس کے مفادات کی راہ میں رکاوٹ نہ بنے بلکہ وہ حکومت اس کے مفادات کی محافظ ہو۔

اس سفر نامے میں مصنف نے امریکیوں کی اس ذہنیت پر طنز کیا جو سب کے لیے الگ الگ معیار اپنائے ہوئے ہیں۔ کہیں تو وہ اپنے کسی مارے جانے والے سپاہی کی لاش ٹی وی پر نہیں دیکھاتے کہ اس سے امریکی بچوں کی نفسیات پر برا اثر پڑتا ہے مگر دوسری ہی طرف عراق، ایران پر ڈھائے جانے والے مظالم کو اپنے میڈیا کے ذریعے اس انداز میں نشر کرتے ہیں گویا یہ انسانی جان کا معاملہ نہیں بلکہ کسی بے جان چیز کے متعلق بات کی جارہی ہو۔

> ایک سابق صدر صدام کو پھانسی کے پھندے ڈالے ٹیلیویژن پر خوب ہی دن رات جھلاتے ہیں۔۔۔ اور اسے پھانسی پر چڑھاتے ہوئے خوب ہی بے عزت کرتے ہیں اور گالیاں دیتے ہیں۔۔۔ کہ یہ انسانی نہیں جانوروں کے حقوق کا معاملہ ہے۔[۵]

اسی طرح ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد جب انگریز دوبارہ دلی پر قابض ہوئے تو وہاں مسلمان مردوں کو بے دریغ قتل کیا گیا۔ جب ایک کرنل نے کہا کہ اس ناشکری اور غدار قوم کے تمام مردوں کو بے شک ہلاک کر ڈالیں جو بچے ذرا قد نکالتے ہوں انہیں بھی، بلکہ زیادہ احتیاط نہ کریں اور ہر عمر کے مردوں کو مار ڈالنے کا قانونی حق آپ کے پاس ہے لیکن ہم لوگ چونکہ انسانی حقوق اور عیسائیت کی نرم دلی پر یقین رکھتے ہیں اس لیے عورتوں اور چھوٹے بچوں کو پھانسی نہ چڑھایا جائے۔ اس درخواست کے جواب میں ایک انگریز جنرل نے کہا کہ:

> انسانی حقوق کا اطلاق انسانوں پر ہوتا ہے جانوروں اور کیڑے مکوڑوں پر نہیں۔۔۔ انہیں تلف کر دینا ہی بہتر ہے۔۔۔ اور ایسا ہی کیا گیا۔۔۔۔[۶]

یعنی اپنی آزادی کے لیے، اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرنے کی وجہ سے انگریزوں نے مسلمانوں کو ظلم و جبر کا نشانہ بنایا اور ان پر کسی قسم کے انسانی حقوق کا اطلاق نہ کیا۔ کیونکہ ان کی نظر میں ہم ایک ناشکری اور غدار قوم ہیں جو اپنی بھلائی کے لیے آئی ہوئی انگریز قوم کے خلاف احتجاج کر رہے تھے۔ اس وجہ سے ہماری حیثیت ان کے سامنے کیڑے مکوڑوں سے کچھ اوپر نہ تھی۔ اس لیے انہوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کے ساتھ ویسا ہی سلوک روا رکھا جیسا جانوروں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ بلکہ انگریزوں کی نظر میں جانوروں کے بھی حقوق مسلمانوں کے حقوق سے کہیں زیادہ ہیں۔

ایک مخصوص تہذیب کے ماننے والوں پر جب اس طرح جبر کیا جائے، ان کے حقوق کی پامالی کی جائے، ان کی آزادی سلب کر لی جائے تو تہذیبی تصادم شدت کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں جو سب کے لیے خطرے کا باعث بھی ہیں۔

کسی حکومت میں معاشی اور سیاسی مفادات کے حصول میں ایک اور چیز جو سب سے اہم کردار ادا کرتی ہے وہ پولیس اور مافیا کا تعلق ہے۔ پولیس اور مافیا ویسے تو دو الگ کردار ہیں لیکن یہ ایسے کردار ہیں جو ایک دوسرے کا ساتھ تو دیتے ہیں مگر ڈھکے چھپے انداز میں، سرعام نہیں۔ اور یہ تعلق کچھ یوں ہوتا ہے کہ بظاہر پولیس کسی مافیا کو پکڑنے کو کوشش کر رہی ہوتی ہے مگر درحقیقت یہ ایک فریب سے بڑھ کر اور کچھ نہیں ہوتا۔ پولیس مافیا کے ساتھ ملی ہوتی ہے اپنا حصہ لے کر اسے بچاتی رہتی ہے۔

پولیس اور مافیا کا یہ تعلق بظاہر تو صرف مشرقی معاشروں میں زیادہ نمایاں کر کے دکھایا جاتا ہے۔ اور یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ ایشیائی ممالک اس حوالے سے خاصے خطرناک ہیں اور مغربی معاشروں میں ایسا کچھ بھی نہیں ہوتا۔ جبکہ حقیقت یہ نہیں ہے۔ حقیقت میں پولیس اور مافیا کا تعلق امریکہ اور یورپ میں بھی ویسا ہی ہے جیسا مشرق میں۔ امریکہ میں پولیس اور مافیا کے اس تعلق کو مصنف نے اس انداز میں بیان کیا ہے:

> اطالوی مافیا کو ایک فرنٹ کی ضرورت ہے۔۔ اس شوروم کے ذریعے اسے یہ سہولت ہے کہ وہ بہت زیادہ نمایاں نہیں ہوتا۔۔۔ پولیس وغیرہ کی نظروں میں نہیں آتا۔۔۔ کسی کو گمان نہیں ہوتا کہ اس شوروم کے پیچھے اطالوی مافیا اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہے۔۔۔ ویسے تو پولیس کو سب خبر ہوتی ہے کہ کون کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے لیکن۔۔۔۔ اسے بھی آسودہ رکھا جاتا ہے اور وہ چشم پوشی کرتی ہے ۔۔ صرف یہ چاہتی ہے کہ آپ ذرا ڈھکے چھپے انداز میں جو کرنا ہے کریں سربازار نہ کریں۔۔۔[ے]

چنانچہ یہ تعلق یہ کردار دونوں معاشروں میں ایک سا ہے مگر ایسے معاملات کو زیادہ نمایاں ایشیائی ممالک کے حوالے سے اس لیے کیا جاتا ہے تاکہ اسے زیادہ غیر محفوظ، غیر تہذیب یافتہ دکھایا جاسکے۔ جبکہ مغرب کے ایسے معاملات کو ہوا نہیں دی جاتی۔ تاکہ اس کی ساکھ اور اس کی نام نہاد تہذیب یافتہ عوام پر کوئی سوال نہ اٹھاسکے۔

ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ ایک ایسی عمارت جو دنیا کی راج دھانی یعنی امریکہ کی راج دھانی ہے جہاں ساری دنیا کے معاشی فیصلے کیے جاتے ہیں۔ اس بلڈنگ کے حوالے سے امریکیوں کا کہنا ہے کہ "دنیا کا دارالسلطنت نیویارک ہے ۔۔۔اور اس نیویارک کا دارالسلطنت، ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ ہے۔۔" [۸]

یہ امریکہ کی ایک بلند و بالا عمارت ہے جس کو دیکھنے کی خواہش ہر سیاح رکھتا ہے۔ اس کی آخری منزل پر پہنچ کر نیویارک کو دیکھنے کی خواہش کی خاطر کئی ڈالر خرچ کر کے وہاں پہنچتے ہیں اور اس نظارے سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

مصنف بھی اس نظارے سے لطف اندوز ہونے کے لیے اس بلندی پر چڑھتا ہے مگر پھر وہی تیسری دنیا کے فرد کی محرومیوں کو احساس پیدا ہونے لگتا ہے۔ کیونکہ مصنف کے خیال میں اس سے کہیں زیادہ بلند عمارت چین کے، گلابوں کے شہر شنگھائی میں موجود ہے مگر اس کی اتنی ناموری نہیں کیونکہ وہ ایشیا میں ہے۔ اس ناانصافی کا ذکر کچھ اس انداز میں ملتا ہے:

> چین کے۔۔۔گلابوں کے شہر شنگھائی میں۔۔۔سمندر کے کنارے جن ماؤ ٹاورز نامی ایک عمارت ہے جو ایمپائر سٹیٹ کو بلندی میں پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔۔۔چونکہ جن ماؤ ٹاورز ایشیا میں ہے اس لیے اس کا کچھ چرچا نہیں ہوتا۔۔۔کچھ ناموری اور شہرت نہیں ہوتی اور اس سے کہیں نچلے درجے پر فائز ایمپائر سٹیٹ کی کل عالم میں دھوم ہے۔۔۔صرف اس لیے کہ اُسے زرد چینیوں نے تعمیر کیا اور اسے گوروں نے بنایا، حسن کرشمہ ساز صرف گوروں کا ہے۔۔۔ادھر بھوری رنگت ہو یا زرد چہرے ہوں تو ان میں نہ کوئی حسن ہے تو کرشمہ کہاں سے آجائے گا۔۔[۹]

مصنف کے خیال میں ایشیائی عوام جہاں تک مرضی پہنچ جائے اس کو ہمیشہ کم تر ہی دیکھا جائے گا۔ بات چاہے اس کی بنائی گئی عمارات کی ہی کیوں نہ ہو اس کو وہ عالمی سطح پر وہ پذیرائی نہ ملے گی جو انگریزوں کی بنائی گئی اس کم تر عمارتوں کو ملے گی۔ اور اس کو تمام دنیا میں وہ شہرت اور ناموری ملے گی جس کی شائد وہ حق دار بھی نہیں ہو گی۔

جدید ذرائع مواصلات جیسے ٹی وی، موبائل، الیکٹرونک میڈیا وغیرہ کی مدد سے بھی امریکی اپنا تسلط تمام دنیا پر قائم کرنا چاہتے ہیں۔

میڈیا کا عوام کو دھوکہ دینے کا انداز منفرد ہی ہے۔ ہر چیز، ہر بات، ہر واقعہ کو اپنی اپنی پسند کا چغہ کو پہنا کر اپنے انداز میں پیش کرنا میڈیا کا خاصہ ہے۔ کہیں عراق، ایران اور فلسطین میں کئی انسانی جانوں کو ختم کر کے انہیں دہشت گرد بنا کر پیش کر دیا جاتا ہے اور کہیں ایک چڑیا کے بچے کی موت پر طوفان کھڑا کر کے عوام کو بے وقوف بناتے رہتے ہیں۔

اگر ایک درجن فلسطینی بچے اور عورتیں اسرائیل گن شپ ہیلی کاپٹروں کے راکٹوں سے لوتھڑوں میں بدل جاتے ہیں تو امریکی میڈیا پر خبر یہ ہو گی کہ آج اسرائیل نے ایک درجن دہشت پسندوں کو عین اس وقت ہلاک کر دیا جب وہ اسرائیل پر ایک خود کش حملہ کرنے والے تھے۔۔۔ اور ادھر تل ابیب میں کسی درخت پر بیٹھا چڑیا کا ایک بچہ بھی ہلاک ہو جاتا ہے تو ہر چینل پر۔۔۔ ماتم شروع ہو جاتا ہے کہ ذرا دیکھئے ان دہشت پسندوں نے ایک پر امن اور معصوم چڑیا کے بچے کو کس بے دردی سے مار ڈالا ہے۔۔۔۔ ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں اس چڑیا کے بچے کی تدفین کی جارہی ہے۔۔۔ اس براہ راست نشریے کو دیکھ کر یورپ اور امریکہ میں آنسوؤں کی جھڑیاں لگ جاتی ہیں۔۔

> اسی میڈیا پر عراق پر حملے سے بہت پہلے جب امریکی وزیر خارجہ میڈلین اوبرائٹ سے سوال کیا جاتا ہے کہ عراق پر پابندیوں کے نتیجے میں لاکھوں عراقی بچے مناسب دوائیں نہ ملنے پر مر گئے ہیں تو انہوں نے کندھے جھٹک کر کس بے اعتنائی سے جواب دیا تھا کہ۔۔۔۔ ہاں ہم تک بھی یہ خبر پہنچی ہے لیکن ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔۔۔۔ [۱۱]

یہ امریکی تضاد کی ایک ہلکی سی جھلک ہے کہ کہیں تو ایک چڑیا کے بچے کی موت پر ہنگامہ کھڑا ہو جاتا ہے کہیں لاکھوں انسانی جانوں کے ضیاع پر ندامت یا افسوس کا ایک آنسو بھی نہیں گرتا۔ بلکہ اس ضیاع کو امریکی اپنا دفاع بنا کر پیش کرتے ہیں۔

امریکی زندگی کے بہت سے معاملات میں ناانصافی بھی کر جاتے ہیں۔ جیسے ایشیاء سے کوئی معذور شخص اپنی تمام تر قابلیت کے ساتھ یہاں آئے تو وہ اپنی معذوری ثابت کر دینے کے بعد کچھ سہولتوں سے تو فائدہ اٹھا سکتا ہے، جیسے مختلف یونیورسٹیز میں کورسز کروائے جاتے ہیں، معذوری کے حوالے سے بہتر علاج کی سہولیات دی جاتی ہیں، مگر وہ معذور اپنی قابلیت اور صلاحیت کے حوالے سے کسی شعبے کا انتخاب خود نہیں کر سکتا، کیونکہ یہ حق صرف ایک

مقامی امریکی یا کسی سفید فام کو حاصل ہوتا ہے۔ کسی ایشیائی باشندے کو نہیں۔ وہ صرف سیلز مین، ڈرائیور یا سکیورٹی گارڈ بن سکتا ہے۔

یہ ملک اپنے تمام تر مساوات اور آزادی کے نعروں کے باوجود تخصیص کرتا ہے۔۔۔ تارکین وطن، اگر ان کی رنگت جدا ہو تو ان کے حصے میں اکثر وہی کام آتے ہیں جو سفید فام پسند نہیں کرتے۔۔

> اور اگر اس سطح سے آپ بلند ہوتے ہیں تو بے شک آپ ایک بین الاقوامی شہرت یافتہ ماہر معیشت ہوں۔۔۔ بینکر یا اپنے پیشے میں یکتا ہوں تو بھی امریکی نظام میں آپ ایک خاص حد سے آگے نہیں جا سکتے کہ آگے صرف وہ جاسکتے ہیں جن کی رنگت سفید ہو۔۔ [۱۱]

یعنی امریکی بظاہر تو مساوات، آزادی کے نعرے لگاتے ہیں مگر یہ سب صرف نعروں تک ہی محدود ہے۔

حقیقت میں وہ کسی کو اپنے سے آگے جاتا نہیں دیکھ سکتے اس لیے یہ رنگ و نسل کا فرق کرتے ہیں۔ اس لیے اپنی تہذیب کی برتری زبردستی مسلط کرنا چاہتے ہیں اور باقی سب کو اپنے زیر دست ہی رکھنا چاہتے ہیں۔ اس لیے قابلیت اور صلاحیت ہونے کے باوجود کسی ایشیائی کو اس سطح تک نہیں پہنچنے دیا جاتا جہاں کا وہ حق دار ہوتا ہے بلکہ اس کی وہ جگہ کسی ایسے سفید فام کو دے دیتے ہیں جو اس کا کسی طرح بھی حق دار نہیں ہوتا۔

شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبال نے بھی جب مغرب کا سفر کیا تو انہوں نے بھی اس نظام میں موجود خامیوں کو گہری نظر سے دیکھا اور ان کی اس دوغلی پالیسی پر تنقید بھی کی۔ اپنی نظم "خضرِ راہ" کے ایک بند میں اقبال نے مغربی تہذیب اور اس کے جمہوری نظام کے علاوہ اس کے اداروں پر برمحل تنقید کی ہے، جس سے اقبال کے ہاں شعور کی گہری، کار فرمائی، ادراک کی سطح اور تجزیے کی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے:

ہے وہی سازِ کہن، مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طبِ مغرب میں مزے میٹھے، اثر خواب آوری

گرمیِ گفتارِ اعضائے مجالس الاماں
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری!
اس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ! اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

بانگِ درا

علم و تحقیق کے سوتے جب وحی سے منقطع ہو جائیں تو پھر اس کے نتیجے میں الحاد پھیلتا ہے۔ مادّی ترقی کے مظاہر ایک سیکولر معاشرے میں نگاہوں کو چکاچوند کر سکتے ہیں مگر اس سے دل کی دنیا برباد اور خوئے آدمیت مجروح ہو جاتی ہے۔ علامہ اقبال نے مغرب کی اس سائنسی ترقی اور ثقافتی انقلاب کا آج سے ایک صدی قبل خود اپنی نگاہوں سے مشاہدہ کیا، اس لیے ان کے تجزیات میں ایک گہرائی اور دردمندی دکھائی دیتی ہے۔ ایسے ہی مغربی معاشرے کی تصویر کشی کرتے ہوئے وہ مذکورہ نظم میں کہتے ہیں:

یورپ میں بہت روشنیِ علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
رعنائیِ تعمیر میں، رونق میں، صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں، بنکوں کی عمارات
ظاہر میں تجارت ہے، حقیقت میں جُوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگِ مفاجات
یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیم مساوات
بیکاری و عریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کی فتوحات؟
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ؟
دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

بالِ جبریل

انسان کے ہاتھوں انسان کا استحصال اس بات کا ثبوت ہے کہ وقت اور دنیا کی ترقی کے ساتھ ساتھ انسانی وسائل تو بڑھے ہیں لیکن مسائل کم نہیں ہوئے۔ اور اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ انسانی وسائل پر ماضی کی طرح آج بھی

کچھ انسان فرعون بن کر بیٹھے ہیں جو اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق دوسروں کی زندگیوں کے فیصلے کرتے ہیں۔ جیسا کہ امریکہ اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق دوسرے ممالک کی معاشی و سیاسی پالیسیاں طے کرتا ہے اور وہاں اپنی مرضی کے فیصلے لاگو کرواتا ہے۔

امریکہ کی اس ہٹ دھرمی اور اس کی طرف سے کیے جانے والے استحصال کو سامراجیت بھی کہا جاسکتا ہے۔ سامراجیت میں بھی قابض حکومت ماتحت علاقوں پر اپنی ڈپلومیسی لاگو کرواتی ہے تاکہ وہاں اپنا اختیار اور تصرف بڑھا سکے۔

سامراجیت کی تعریف وکی پیڈیا پر کچھ یوں ملتی ہے:

ایک ملک کی سرحدوں سے باہر جاکے دوسرے ملک کے اختیارات پر دخل اندازی کرنے کے عمل کو سامراجیت (Imperialism) کہا جاتا ہے۔ یہ دخل اندازی جغرافیائی، سیاسی یا اقتصادی طور پر ہو سکتی ہے۔ [۱۲]

سامراجیت کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ سامراجی طاقت اپنے آپ کو باصلاحیت اور ہنر مند کے طور پر متعارف کرواتی ہے اور قابض ممالک کو غیر تہذیب یافتہ قرار دے کر ان پر حکمرانی کرنے لگتی ہے۔ بظاہر اس سامراجی طاقت کا مقصد انہیں علوم و فنون سے آشنا کر کے فلاح و بہبود کی شاہراہ پر گامزن کرنا ہے جبکہ پس پردہ محرکات میں اس قوم پر غالب رہ کر حکمرانی کرنا شامل ہوتا ہے۔ اس طرح کے مختلف بہانوں سے طاقتور قومیں کمزور قوموں کا استحصال کرتی رہی ہیں۔

امریکہ کے سرمایہ دارانہ نظام کے حوالے سے نیویارک ٹائمز میں شامل ایک اقتباس کتاب امریکہ کا سرمایہ دارانہ نظام میں کچھ یوں درج ہے:

ہمارا سرمایہ دارانہ نظام وہ پرانا نظام نہیں جس میں اقلیت، اکثریت سے ناجائز فائدہ اٹھائے۔ ہمارا سرمایہ دارانہ نظام ایک نئی چیز ہے۔۔۔۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اجرتیں بڑھائی جائیں، اور زیادہ مال اُن قیمتوں پر فروخت کیا جائے جو عوام ادا کر سکیں۔ اسی طرح عوام کو صنعتوں کی ملکیت میں زیادہ حصہ دیا جائے اور انہیں پیداوار بڑھانے کی قابلیت کا معاوضہ ملے۔ [۱۳]

جبکہ حقیقت اس کے بر عکس ہے امریکی سرمایہ داری نظام میں آج بھی طاقتور طبقہ غالب ہے جو کمزور کا استحصال کر رہا ہے۔ کمزور طبقے کے اسی استحصال کے خلاف اردو ادب میں تحریکیں بھی چلائی گئیں، جیسے ترقی پسند تحریک، جس میں سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف آواز بلند کی گئی اور غریب کو اس کا حق دلوانے کی کوشش کی گئی۔

سرمایہ دارانہ نظام کے اس انداز کی وجہ سے بھی مختلف تہذیبوں کے درمیان تصادم پیدا ہوتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سیموئیل پی۔ ہنٹنگٹن، تہذیبوں کا تصادم مترجم احسن بٹ (لاہور: مثال پبلشنگ ۲۰۰۳ء)، ص۲۳۶۔۲۳۷۔

۲۔ معید الظفر، "تہذیبی تصادم اور فکر اقبال (سرینگر: انسٹی ٹیوٹ آف کشمیر، ۲۰۰۴ء)، ص۸۸۔

۳۔ مستنصر حسین تارڑ، نیو یارک کے سو رنگ (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء)، ص۶۱۔

۴۔ ایضاً، ص۶۸۔

۵۔ ایضاً، ص۳۶۰۔

۶۔ ایضاً، ص۳۶۱۔

۷۔ ایضاً، ص۳۱۱۔

۸۔ ایضاً، ص۳۶۱۔

۹۔ ایضاً، ص۳۶۹۔

۱۰۔ ایضاً، ص۵۳۴۔

۱۱۔ ایضاً، ص۴۰۹۔

۱۲۔ /Ur.wikipedia.org/ wiki سامراجیت ۱۵ مارچ ۲۰۲۰ء، بروز اتوار، 11:59pm۔

۱۳۔ مسیمو سالواڈوری، امریکہ کا سرمایہ دارانہ نظام، (دہلی: حالی پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۵۴ء)، ص۴۔

باب پنجم:

تہذیبی اختلافات: مجموعی جائزہ

باب پنجم:

تہذیبی اختلافات: مجموعی جائزہ

مستنصر حسین تارڑ اردو ادب کے ایسے سفر نامہ نگار ہیں جنہوں نے اس صنف کو نئی جہت عطا کی۔ مستنصر حسین تارڑ کو سیر و سیاحت کا بہت شوق رہا۔ اپنے اس شوق کی تکمیل کی خاطر مستنصر حسین تارڑ نے پاکستان کے اندر اور پاکستان سے باہر متعدد بار سفر کیا اور اپنے ہر سفر کی روداد کو انہوں نے مختلف انداز میں اپنے سفر ناموں کا حصہ بنایا ۔ ان کے سفر نامے سفری روداد کے ساتھ ساتھ ایک علاقے کی تہذیب و ثقافت، وہاں کی معیشت و سیاست کو بھی اپنے اندر سموتی ہے۔ ان کی اس تخلیقی صلاحیت کے حوالے سے عرفان جاوید کا کہنا ہے کہ "مستنصر حسین تارڑ صاحب ایسے کاہن ہیں جو بے جان الفاظ کو چھو کر زندگی بنا دیتے ہیں۔"[1]

مستنصر حسین تارڑ نے جب پاکستان سے باہر مختلف ممالک کے سفر اختیار کیے تو وہاں موجود لوگوں کی رنگ و نسل کے اختلاف، شکل و صورت، تاریخ، جغرافیہ، آب و ہوا، لباس، ثقافت، زبان، مذہب، رسم و رواج، اندازِ فکر، معاشرتی اقدار و رویے، اخلاقی قدریں، ادب و آداب وغیرہ کے فرق کو بھی اپنے سفر ناموں کا حصہ بنایا۔ افراد و اقوام کی اسی رنگا رنگی اور تنوع پر دنیا کی خوبصورتی کا دارومدار ہے۔ اگر دنیا میں ایک ہی رنگ و نسل کے لوگ آباد ہوں اور انسانوں کے دیگر متعلقات بھی ایک جیسے ہوتے تو یہ دنیا اتنی دلچسپ نہ ہوتی۔ دنیا کی اسی خوبصورتی اور رنگا رنگی نے انسان کو سفر کا شائق بنایا اور یوں انسان عجائبات عالم کی تلاش میں دنیا کے مختلف خطوں کے سفر پر نکل کھڑا ہوا۔

مستنصر حسین تارڑ نے جب یورپ و امریکہ کا سفر اختیار کیا تو ان ممالک میں قیام کے دوران انہوں نے ان ممالک کی تاریخ، جغرافیہ، رنگ و نسل، تہذیب و تمدن، معاشرتی اقدار، اخلاقی اقدار، مذہب، ثقافت، زبان، سماجی رویوں کی شکست و ریخت اور مختلف اندازِ فکر غرض ہر چیز کے حوالے سے مشاہدہ کیا اور ان حوالوں سے معلومات اکٹھی کرنے کی کوشش کی۔ جب انہوں نے ان تمام حوالوں پر قلم اٹھایا تو اشتراکات و اختلافات کو دیکھتے ہوئے تیسری دنیا کے باشندے کا احساسِ محرومی بھی ان کی تحریروں میں جھلکتا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ نے مختلف معاشروں میں قیام کے دوران نہ صرف وہاں موجود اشیاو مظاہر کو اپنی دلچسپی

کامرکز بنایا بلکہ ان ممالک میں بسنے والے لوگوں کو، ان کے اندازِ فکر کو بھی اپنے مطالعے کا موضوع بنایا اور ان کی معاشرتی زندگی اور سماجی رویوں کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ انہوں نے نہ صرف لوگوں کے ظاہری احوال میں دلچسپی لی بلکہ ان کے اندرون میں جھانکنے کی کوشش بھی کی اور ان کے طور اطوار سے، ان کے اٹھنے بیٹھنے اور بات کرنے کے انداز سے اور ان کی طرز زندگی سے ان کی نفسیاتی کیفیات کو بھی جاننے کی کوشش کی اور انہیں اپنے سفر ناموں کا حصہ بنایا۔ وہ جہاں بھی گئے ان ممالک کے معاشروں کا اور وہاں کی تہذیب وثقافت کا قریب سے مطالعہ ومشاہدہ کیا۔ اور ان کی مختلف چیزوں کو اپنی سفری روداد میں بیان کیا۔

جب کبھی ایک تہذیب کی خصوصیات کا تقابل دوسری تہذیب سے کیا جائے تو یقیناً تہذیبی تصادم رونما ہوتا ہے۔ کیوں کہ ہر تہذیب کی اپنی الگ خصوصیات، الگ شناخت ہوتی ہے۔ تہذیبوں کو ان کے اسی فرق کے ساتھ قبول کرنا چاہیے کیونکہ یہی تہذیبوں کی خوبصورتی اور دنیا میں رنگا رنگی کی وجوہات ہیں۔ ورنہ اگر دنیا کی تمام تہذیبوں کو ایک ہی رنگ میں رنگ دیا جائے، تمام لوگوں کو ایک ہی تہذیب کا پیروکار بنا دیا جائے تو دنیا کی خوبصورتی قائم نہ رہے۔

مختلف تہذیبوں کے درمیان ہونے والے تصادم کو انگریز ماہر سیاسیات سیموئیل فلپس ہنٹنگٹن نے

The Clash of Civilizations کا نام دیا ہے۔ تہذیبوں کے تصادم کا یہ نظریہ سیموئیل نے پہلے پہل اپنے ایک آرٹیکل میں دیا کچھ عرصے بعد اس آرٹیکل کو کتابی صورت میں شائع کیا اور ان چیزوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا جو اس آرٹیکل میں ادھوری رہ گئی تھیں۔

اپنی اس کتاب میں مصنف نے سرد جنگ کے بعد عالم نظام کیا اور کیسا ہوگا؟ اس حوالے سے بات کی ہے۔ ہنٹنگٹن کا کہنا ہے کہ مستقبل میں جنگیں ممالک کے درمیان نہیں بلکہ مختلف تہذیبوں کے درمیان لڑی جائیں گی۔ اس کے مطابق تہذیبوں کے اختلاف سے پوری دنیا میں تضاد پیدا ہوگا۔ اور خاص طور پر اس وقت جب ایک تہذیب اپنی اقدار و روایات کو آفاقی یا عالمی تہذیب کی صورت میں پیش کرے گی اور باقی تہذیبوں کے وجود کو ان کی خصوصیات کے ساتھ قبول کرنے کی بجائے ان پر اپنی اقدار و روایات زبردستی مسلط کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ ہنٹنگٹن کا کہنا ہے کہ دنیا اب کثیر تہذیبی بن چکی ہے جس میں ہر علاقے کا اپنا مخصوص تہذیبی وجود ہے جو اپنی ایک

اہمیت بھی رکھتا ہے۔ جب کوئی تہذیب اس وجود کو اوراس کی انفرادی اہمیت کو ختم کرنے کی کوشش کرتی ہے تب تہذیبی اختلافات جنم لیتے ہیں۔

مغرب نے اپنی تہذیب کو کب آفاقی سمجھنا شروع کیا اس حوالے سے ہنٹنگٹن کا کہنا ہے کہ:

> بیسویں صدی کے اواخر میں اس ہمہ گیر اور تنگ نظری پر مبنی خیال کو فروغ ملا کہ مغرب کی یورپی تہذیب اب دنیا کی آفاقی تہذیب ہے۔[۲]

یہ نظریہ اس لیے پیش کیا گیا کہ مغربی ثقافت ساری دنیا کی ثقافتوں میں اپنا ایک الگ اور بلند مقام رکھتی ہے اس لیے اس کی ثقافت کو عالمی ثقافت کے طور پر تسلیم کیا جائے جبکہ حقیقت میں ایسا ناممکن ہے مغربی تہذیب کی اسی ہٹ دھرمی کی وجہ سے تہذیبوں کے درمیان اختلافات رونما ہو رہے ہیں۔

اور ان اختلافات کے پیچھے اہل مغرب کی ایک سوچ کار فرما ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو سب سے برتر اور باقی سب کو کمتر سمجھتے ہیں۔ ہنٹنگٹن کا کہنا ہے کہ:

> لوگوں کے ساتھ مختلف برتاؤ کے پس پشت مختلف نظام (کوڈز) کار فرما ہوتے ہیں کہ ایک تو ہم جیسے ہیں اور دوسرے جو نہیں ہیں وہ "وحشی" ہیں۔۔۔۔۔۔ تہذیبی "ہم" اور بالائے تہذیبی "وہ" انسانی تاریخ میں مستقل رہا ہے۔[۳]

یعنی خود کو تہذیب یافتہ کہنا اور غیر مغربیوں کی تہذیب و ثقافت موجود ہوتے ہوئے بھی ان کو غیر تہذیبی کہہ کر ان پر حکمرانی کرنا اہل مغرب کا برسوں سے شیوہ رہا ہے۔ حالانکہ اہل مغرب جس تہذیب اور جس علم و فن پر آج غرور کرتے پھر رہے ہیں یہ سب چیزیں ان کی اپنی ایجاد کردہ نہیں ہیں بلکہ دیگر تہذیبوں کے تحفے ہیں جن پر آج اہل مغرب ناز کرتے ہیں۔

مشرقی لوگ جب مغرب میں جاتے ہیں تو چٹی چمڑی کے سامنے احساس کمتری انہیں چین نہیں لینے دیتا۔ جب لباس اور مذہب کی تبدیلی سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تو مغربی بننے کے چکر میں اپنی تہذیب کو پیچھے چھوڑتے چلے جاتے ہیں۔ بانو قدسیہ اس حوالے سے ناول حاصل گھاٹ میں لکھتی ہیں:

> اگر کبھی مشرق نے مغرب کی سوچ میں ضم ہونے کی کوشش کی بھی ہو تو اسے مذہب سے ہاتھ دھو کر فلاح کا راستہ چھوڑ کر یہ منزل مل سکے گی۔۔۔۔ پھر شرمندگی، احساس گناہ بے حیائی کا نیا سفر ہو گا اور مشرقی لوگ۔[۴]

ناول حاصل گھاٹ میں بانو قدسیہ نے اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب کے تصادم پر روشنی ڈالی ہے کہ مشرقی تہذیب اور مغربی تہذیب کبھی آپس میں ضم نہیں ہو سکتیں کیونکہ مشرق میں فلاح کی تلاش جاری و ساری ہے۔ مگر موجودہ صورت حال میں ہم مغرب کی کھوکھلی تہذیب کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ تیسری دنیا کے باشندے اپنی شناخت کو ختم نہ کریں۔ اپنی تہذیب کو اعلیٰ سمجھیں اور اس کی ان اقدار کی قدر کریں جو صرف ان کی تہذیب کا خاصہ ہیں۔ مغرب سے مرعوبیت کے حوالے سے اسی ناول کا ایک کردار کہتا ہے:

> نثار صاحب ہم مغرب سے مرعوب ہو چکے ہیں۔ ہمیں بھول چکا ہے کہ ہمارے پاس بھی کوئی علم ہے یا تھا۔[۵]

بانو قدسیہ کو یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ ہم مغربی دنیا سے کس قدر خوف زدہ ہیں۔ ہم اپنے شاندار ماضی کو فراموش کر چکے ہیں۔ مسلمانوں نے جدید علوم کی بنیاد رکھی مگر آج ہم پس ماندگی کا شکار ہیں۔ اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب میں تصادم سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ اسلامی تہذیب پر مغربی تہذیب کی یلغار کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ مغربی ممالک کی معیشت بہت مضبوط ہے اور طاقت بھی انہی کے پاس ہے۔ ہم جو مغربی تہذیب کی تقلید کر رہے ہیں ان میں یہ دونوں عناصر بہت اہمیت کے حامل ہیں۔

یہ اختلافات جہاں تہذیب و ثقافت، مذہب، جغرافیہ، سیاست و معیشت میں فرق کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں وہیں یہ اختلافات ذرائع مواصلات کی وجہ سے بھی پیدا ہوتے ہیں۔ عالمی ذرائع مواصلات مغربی قوت کے سب سے اہم معاصر ظہور میں سے ایک ہیں۔ میڈیا پر دکھائی جانے والی ایک ہی خبر مختلف ممالک کے لوگوں پر مختلف انداز میں اثر کرتی ہے۔ جیسے امریکہ کے عراق پر حملے کو امریکی قوم تو خوشی کے ساتھ سنے گی کیونکہ ان کی نظر میں عراق پر امریکی حملے کی ٹھوس وجوہات موجود ہیں جبکہ یہی خبر عراقیوں پر ہرگز اچھا اثر نہیں ڈالے گی۔

ذرائع مواصلات پر مغربی غلبے کے حوالے سے ہنٹنگٹن کا کہنا ہے کہ:

ذرائع مواصلات پر مغربی غلبے نے غیر مغربی لوگوں میں مغرب کے خلاف معاندت اور اشتعال کو بڑھاوادیا ہے۔[۷]

امریکی میڈیا جس خبر کو چاہے اپنی مرضی کے رنگ میں بیان کر سکتا ہے اور اسے باقی دنیا میں بھی اپنی مرضی کے رنگ میں پھیلا دیتا ہے۔ جیسے اپنے سفر نامے میں مصنف بتاتے ہیں کہ کس طرح امریکی میڈیا عراق پر حملے کو ایک معمولی خبر کی طرح بتاتا ہے اور وہاں انسانی جانوں کے ضیاع پر بھی کسی دکھ کا احساس نہیں ملتا جبکہ ایک چڑیا کے بچے کی موت کا نقشہ یہ میڈیا ایسا کھینچتا ہے کہ تمام عوام اس غم کو محسوس کرتی نظر آتی ہے۔یعنی چڑیا کے بچے کی موت پر تو غم کا احساس ان کے اندر پیدا ہوتا ہے جبکہ بے گناہ عراقیوں کی موت پر کہیں غم کا احساس نہیں ملتا۔

جب کوئی آفاقی تہذیب ظہور میں آرہی ہو تو مذہب اور زبان جو کسی بھی تہذیب کے مرکزی عناصر میں شامل ہیں ان کا بھی آفاقی ہونا ضروری ہے۔ زبان کے حوالے سے تو اکثر یہ دعوی کیا جاتا ہے کہ "عالمی زبان انگریزی ہے۔"اس دعوی سے تو یہ لگتا ہے کہ دنیا میں انگریزی زبان بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے جبکہ حقیقت میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ اسی طرح مذہب کے حوالے سے دیکھا جائے تو مغربی تہذیب میں ابھی تک کوئی ایسا مذہب نہیں ہے جو تمام دنیا کو متاثر کر سکے۔ کیونکہ وہاں کبھی عسائیت زور پکڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور کبھی یہودی اپنا اثر اور غلبہ دکھاتے نظر آتے ہیں۔یعنی مغربی تہذیب کے پاس نہ تو آفاقی زبان موجود ہے ایک ایسی زبان جو دنیا کے زیادہ حصوں میں بولی اور سمجھی جائے اور نہ ہی کوئی ایسا مذہب موجود ہے جو باقی دنیا کو متاثر کر سکے۔

اس کے برعکس اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو مختلف ممالک میں بسنے والوں اور مختلف زبانیں رکھنے والے لوگوں کو اپنی تعلیمات سے متاثر کرتا چلا جارہا ہے۔ اس مذہب میں ایسی تمام خصوصیات موجود ہیں جو تیزی سے جدیدیت کی طرف جاتی ہوئی تمام تہذیبوں کی ضروریات کو نہ صرف سمجھتا ہے بلکہ ان کی تکمیل بھی کر سکتا ہے۔

مذہب اسلام ہمیشہ مساوات اور تقویٰ کی تعلیمات دیتا ہے۔ اس کے ماننے والے بھی ان تعلیمات پر عمل کرتے ہیں تبھی ہم دین اسلام کے اس سبق کو بھولے نہیں کہ کسی گورے کو کالے پر اور کسی کالے کو گورے پر کوئی برتری حاصل نہیں سوائے تقویٰ کے۔یعنی مذہب اسلام ہمیشہ تقویٰ، رواداری، محبت اور مساوات کا درس دیتا ہے۔ جبکہ مغربی تہذیب میں ایسی کوئی خصوصیت نہیں جو دیگر تہذیبوں کے پیروکاروں کو اپنی طرف مائل کر سکے۔ بلکہ وہاں ہمیشہ مذہب، زبان اور رنگ و نسل کے حوالے سے تفریق کی جاتی ہے۔ انسانی حقوق کے وہ تمام اصول و قوانین

جو بظاہر تو تمام انسانوں کے لیے بنائے جاتے ہیں مگر ان تمام پر عملدرآمد صرف امریکیوں کی حد تک ہی ہوتا۔ باقی تمام مختلف اقوام اور مذاہب سے تعلق رکھنے والوں کے ساتھ امریکیوں کا سلوک انتہائی حقارت آمیز ہوتا ہے۔ برابری اور انسانی حقوق کی علمبرداری محض ایک دکھاوا ہے جو امریکی بہت ذوق و شوق سے کرتے ہیں۔ حقیقت میں غیر مغربی لوگوں کے ساتھ ان کے رویے انسانیت کے درجے سے بھی گرے ہوئے ہوتے ہیں۔ جیسے امریکی سیاہ فاموں کو ہمیشہ حقارت کی نگاہ سے ہی دیکھتے ہیں۔ نہ کبھی خود ان کے برابر بیٹھتے ہیں نہ انہیں اپنے برابر بیٹھنے کی اجازت دیتے ہیں۔ بلکہ اگر کسی جگہ پر سیاہ فام زیادہ تعداد میں آنا شروع ہو جائیں تو یہ سفید فام اس جگہ، اس مقام سے ہی کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں۔

> جہاں کوئی سیاہ فام دین و دنیا سے بے پرواٹانگیں پھیلائے کانوں میں ائیر پلگ ٹھونسے بیٹھا جھومتا ہے
> اس کے برابر میں بیٹھنے سے ہر کوئی اجتناب کرتا ہے۔۔۔[۷]

یہ نسلی امتیاز اہلِ مغرب میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ ایسا ہی حقارت آمیز سلوک یہودیوں کے ساتھ بھی کیا جاتا رہا ہے۔ یہاں تک کہ یہودیوں نے اس حقارت آمیز رویے پر کوئی ردِ عمل دینے کی بجائے اپنے آپ کو مضبوط بنایا اور اپنے اندر ایسی صلاحیتیں پیدا کیں کہ آج وہ مغربی دنیا میں تقریباً ہر کاروبار پر اپنا قبضہ جمائے ہوئے ہیں۔ امریکہ کا معروف ترین شہر نیو یارک بھی "جیویارک" کے نام سے پہچانا جانے لگا۔ انہوں نے اس جگہ رہتے ہوئے اپنے آپ کو اتنا مضبوط کیا کہ اب وہ امریکی معیشت پر حکمرانی کر رہے ہیں۔

> نیو یارک کو جیویارک بھی کہا جاتا ہے کہ اس شہر میں زرد شیطان کے جتنے سنہری معبد ہیں۔۔۔۔ جہاں سونے کی ڈالیاں آبشاروں کی صورت برستی ہیں۔۔۔۔ بین الاقوامی کاروبار، بینک، جائیدادیں، میڈیا۔۔۔ ان سب پر یہودی حاوی ہیں اور بے وجہ حاوی نہیں ہیں، ان میں اتنی اہلیت ہے کہ وہ اقلیت میں ہونے کے باوجود اکثریت پر چھائے ہوئے ہیں۔[۸]

اس طرح یہودیوں نے اپنی قابلیت و لیاقت کی وجہ سے امریکیوں کے درمیان اپنی جگہ بنائی اور تقریباً تمام کاروبارِ زندگی پر چھا گئے۔ اور تمام امریکہ پر اپنا ایک اثر قائم کر دیا۔

چنانچہ مغربی تہذیب اور مشرقی تہذیب میں بنیادی فرق ان اقدار و روایات اور تعلیمات کا ہے جو مشرقی تہذیب اور مذہب اسلام کا خاصہ ہیں جن سے مغربی تہذیب بے بہرہ ہے۔

مذہب اسلام ہے۔ کیونکہ اس کے اندر ہی وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو مغربی تہذیب میں نہیں ہیں۔ مذہب اسلام کی انہی تمام خصوصیات سے متاثر ہو کر بہت سے لوگ اس مذہب کی طرف مائل ہوئے ہیں۔ اور اس کے دائرہ اثر میں داخل ہوئے ہیں۔

اسی طرح مختلف وجوہات کی بنا پر اپنا ملک چھوڑنے والے جن کا تعلق مختلف مذاہب سے تھا۔ ۱۹۹۰ء میں تارکینِ وطن میں زیادہ تعداد مسلمانوں کی تھی۔ اسلامی تہذیب و ثقافت کی یہ خاصیت ہے کہ وہ کسی دوسری تہذیب میں ضم ہونے کی بجائے اپنی انفرادیت برقرار رکھتی ہے۔ اسلامی تہذیب کی اسی انفرادیت کی وجہ سے مغربی تہذیب خوفزدہ ہے کہ کہیں مستقبل قریب میں وہ جگہ جہاں مغربی تہذیب اپنے آپ کو دیکھنا چاہتی ہے وہاں اسلامی تہذیب موجود نہ ہو یعنی بطور ایک آفاقی تہذیب کے مغرب اپنی تہذیب کو آفاقی تہذیب کا مقام دلانا چاہتا ہے۔ لیکن اسے یہ خوف ہے کہ کہیں اسلامی تہذیب و ثقافت اپنا اثر دکھاتے ہوئے آفاقی تہذیب کا مرتبہ نہ حاصل کر لے۔

تہذیبوں کے درمیان موجود ایسے ہی فرق اکثر بڑے پیمانے پر تہذیبی تضادات / تہذیبی اختلافات کی وجہ بنتے ہیں۔ جنہیں مستنصر حسین تارڑ نے اپنے سفر نامے نیو یارک کے سو رنگ کا حصہ بنایا۔

مذہب کے اشتراکات و اختلافات کو ابنِ انشا نے بھی اپنے سفر ناموں کا حصہ بنایا۔ انشا نے یورپ و امریکہ کے سفر کے دوران جہاں دیگر حوالے سے معلومات اکٹھی کیں وہیں مذہبی حوالے سے معلومات بھی اکٹھی کیں۔ انہوں نے مختلف مذاہب کے لوگوں کے اعتقادات، مذہبی جوش و جذبے اور ان کی مذہبی رسومات وغیرہ کے حوالے سے معلومات جمع کیں اور پھر ان سب چیزوں کا تقابل پاکستانیوں کی متعلقہ معلومات سے کیا اور ان کے درمیان اشتراکات و اختلافات کو بیان کیا۔

جیسے اسلام اور عیسائیت کا تقابل کرتے ہوئے وہ بتاتے ہیں کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جہاں نیکی و گناہ اور اس کے اجر و ثواب اور ان کی بخشش کا اختیار خدا کی ذات کو حاصل ہوتا ہے کہ وہ ہمارے گناہوں کو معاف کرے یا نہ کرے جبکہ عیسائیت کے رومن کیتھولک فرقے میں ہر ہفتے ایک پادری آتا ہے جو وہاں موجود لوگوں سے کہتا ہے کہ جو شخص دل سے معافی مانگے گا تو میں اسے خداوند سے معافی دلوا سکتا ہوں۔ یعنی وہ اختیار جو صرف قادرِ مطلق ذات کو حاصل ہے وہ کسی انسان کے پاس کیسے ہو سکتا ہے۔

اس طرح مذہبی تہواروں کو منانے کے مخصوص انداز کے حوالے سے انشا کو اختلاف نہیں بلکہ اشتراک کی خصوصیت نظر آتی ہے۔ جس طرح مسلمان مذہبی تہواروں کو خاص اہتمام سے مناتے ہیں اور خصوصی پکوانوں کا اہتمام کرتے ہیں اسی طرح امریکی بھی اپنے تہواروں پر کچھ مخصوص پکوان بناتے ہیں اور پھر ہر جگہ وہی کھانا نظر آتا ہے۔ جیسے پاکستان میں عید کے موقع پر سویاں یا کھیر بنانے کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے، اسی طرح امریکی اپنے تھنکس گیونگ ڈے پر ٹرکی نامی ڈش بنانے کا خصوصی اہتمام کرتے ہیں۔

اہلِ مغرب کو یوں لگتا تھا کہ دنیا میں جدیدیت کو لانے والے اور اس کو پھیلانے والے صرف وہی ہیں۔ ان کے خیال میں جدیدیت کو اولاً فروغ انہی کے معاشرے نے دیا اسی لیے ان کی تہذیب کو جدید تہذیب ہونے کی بنا پر آفاقی تہذیب تسلیم کیا جائے اور اس کی زبان، اقدار و روایات اور تہذیب و ثقافت کو تمام دنیا میں رائج کیا جائے۔ جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ہنٹنگٹن کا کہنا ہے کہ:

> جدیدیت کا مطلب لازماً مغربیت نہیں۔ غیر مغربی معاشرے جدید ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں۔ اپنی ثقافت کو ترک کیے اور مغربی اقدار اداروں اور اعمال کو مکمل طور پر اپنائے بغیر۔[9]

یعنی مغرب جو جدیدیت کی بنا پر اپنی تہذیب و ثقافت زبردستی مسلط کرنے کی کوشش کر رہا ہے لازمی نہیں کہ کوئی معاشرہ ترقی ہی اس وقت کرے جب وہ مغرب کی جدیدیت کو اپنائے۔ بلکہ دیگر معاشرے مغربی جدیدیت کو اپنائے بغیر بھی ترقی کا سفر کرتے چلے جا رہے ہیں۔

جدیدیت در اصل ایک ذہنی میلان ہے جس نے مروجہ اصولوں سے انحراف کیا اور زمانے کو ایک نئی سمت عطا کی۔

تہذیبوں کے درمیان اختلافات کی وجہ اکثر مختلف ثقافتی اقدار بھی ہوتی ہیں۔ ثقافت کسی بھی معاشرے میں موجود ان رسم و رواج اور اقدار کے مجمع کو کہا جاتا ہے جن پر اس کے تمام افراد مشترکہ طور پر عمل کرتے ہوں۔ اس میں مذہب، آرٹ، ادب، رسم و رواج اور اخلاقیات وغیرہ شامل ہیں۔ مختلف تہذیب و ثقافت کی ان تمام اقدار میں موجود فرق کو جب ایک تہذیب تسلیم کرنے کی بجائے ان پر اپنی اقدار زبردستی مسلط کرنا چاہے تو اس زبردستی کی بنا پر بھی تہذیبی اختلافات جنم لیتے ہیں۔ کیونکہ تہذیبوں کا مختلف ہونا قانونِ قدرت ہے اور جب قدرت کے اس قانون

کے خلاف جانے کی کوشش کی جائے کہ تمام دنیا میں ایک سی تہذیب و ثقافت، ایک سی اقدار رائج کرنے کی کوشش کی جائے تو تہذیبی تصادم رونما ہوتے ہیں۔

مغرب کا یہ ماننا ہے کہ شاید اس کی تہذیب و ثقافت نے تمام دنیا کو متاثر کیا ہے جبکہ حقیقتاً ایسا کچھ نہیں ہے۔ بلکہ دوسری تہذیبوں کی مغربی تہذیب کی طرف کشش کچھ کم ہوئی ہے اور غیر مغربی لوگوں نے اپنی ثقافت میں دلچسپی اور وابستگی میں اضافہ کیا ہے۔ چنانچہ اس صورتحال میں اپنی تہذیب کو آفاقی تہذیب ثابت کروانے کی کوشش کرنا دراصل مغرب کا زوال ہے کیونکہ دنیا کثیر تہذیبی بن چکی ہے اور اس کثیر تہذیبی دنیا میں مختلف ثقافتیں اپنا وجود رکھتی ہیں۔

مذہب اور ثقافت کے علاوہ یہ تہذیبی اختلافات مختلف سیاسی و معاشی مفادات کی وجہ سے بھی رونما ہوتے ہیں۔ جب ایک ملک قابض ممالک پر اپنی معاشی و سیاسی پالیسیاں زبردستی لاگو کرواتا ہے تب معاشی و سیاسی مفادات کے اختلاف کی وجہ سے تہذیبی اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔

جب ایک ترقی پذیر ملک اپنی معیشت کو مضبوط بنانے اور دوسرے ممالک پر اپنے تسلط کو برقرار رکھنے کے لیے ایسے اقدامات کرتا ہے جو اس کی معیشت کو تو مضبوط بناتے ہیں لیکن دیگر معیشتوں کی تباہی کی وجہ بنتے ہیں تو اس بنا پر بھی تہذیبی اختلافات رونما ہوتے ہیں۔ ترقی پذیر ممالک اکثر سامراجی نظام حکومت لاتے ہیں اور اپنی مرضی کا نظام قائم کر کے فوائد حاصل کرتے ہیں۔

سامراجیت وہ طریقہ یا عمل ہے جس کا مقصد علاقوں کا حصول، دفاع اور اپنے زیر اثر زیادہ سے زیادہ علاقے کر کے اپنا تسلط قائم کرنا ہے، اس پالیسی کا مقصد اپنی صنعت و تجارت اور سرمائے کو فروغ دینا ہے۔ کسی ملک یا کسی خطے کو اپنے سیاسی یا مالیاتی اختیار میں لا کے وہاں کے باشندوں کو مختلف حقوق سے محروم کرنا اس نظام کی سب سے ظاہری صورت ہے۔ انہی وجوہات کی بنا پر جب تہذیبی تضادات جنم لیتے ہیں تو ان تضادات کے حوالے سے بات کرتے ہوئے ہنٹنگٹن کا کہنا ہے کہ:

> مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھنے والی ریاستوں اور گروہوں میں سرچشمے وسیع معنوں میں، وہی ہیں جنہوں نے ہمیشہ لوگوں میں جھگڑے پیدا کیے ہیں یعنی لوگوں، علاقے، دولت اور ذرائع پر قبضہ-------[10]

امریکیوں نے بھی مقبوضہ ممالک میں یہی سامراجی نظام حکومت قائم کیا اور اپنی مرضی کے مقاصد حاصل کرتے چلے گئے۔ جیسے امریکہ کے مشہور شہر مین ہٹن کو زور زبردستی کے تحت امریکیوں نے حاصل کیا اور اب وہاں ہر طرح کی تجارت اور کاروبار کر کے اپنی معیشت کو مضبوط بنا رہے ہیں لیکن دوسروں کے حق پر غاصب بنے بیٹھے ہیں ۔اس علاقے پر قبضہ امریکیوں نے محض چند قیمتی زیورات اور موتیوں کے عوض حاصل کیا اور آج اس جگہ پر یوں بیٹھے ہیں جیسے یہ جگہ انہوں نے ایک نہایت عدل و انصاف کے سودے کے تحت حاصل کی۔

سیاسی مفادات یا سیاسی وجوہات کی وجہ سے پیدا ہونے تہذیبی تصادم کے حوالے سے ہنٹنگٹن کا خیال ہے کہ:

> سیاسی میدان میں "ہم" بمقابلہ "وہ" رجحان تقریباً آفاقی ہے۔ ہم عصر دنیا میں "وہ" زیادہ سے زیادہ ایسے لوگ ہو رہے ہیں جو کسی دوسری تہذیب سے تعلق رکھتے ہیں۔ سرد جنگ کے اختتام نے جھگڑے کو ختم نہیں کیا بلکہ ثقافت میں جڑیں رکھنے والی نئی شناختوں کو فروغ دیا ہے اور مختلف ثقافتی گروہوں، جو وسیع سطح پر، "تہذیبیں ہیں" کے مابین جھگڑے کی نئی صورتوں کو ابھارا ہے۔[11]

یعنی سرد جنگ کے بعد دنیا ایک نئے تصادم کی طرف قدم بڑھا رہی ہے جو تہذیبی تصادم ہے۔ کیونکہ ایک غالب تہذیب جب اپنا آپ زبردستی کہیں مسلط کرنے لگتی ہے تب تہذیبی تصادم جگہ بناتے ہیں۔ اور آہستہ آہستہ تمام دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔

یہ تہذیبی تصادم اس وجہ سے بھی رونما ہوتے ہیں کہ جب کوئی ملک اپنی معیشت کو مضبوط کرنے کے لیے اور دیگر ممالک کو اپنے زیر تسلط رکھنے کے لیے ایسی معاشی پالیسیاں ترتیب دیتا ہے جو اس کی معیشت کو تو سہارا دیتی ہیں جبکہ باقی ممالک کی معیشت کو ایسی ان دیکھی زنجیروں میں جکڑ دیتی ہیں جن سے آزادی حاصل کرنا ناممکنات میں سے ایک کام لگتا ہے۔

اور یہ کام اکثر مختلف مواقع پر امداد دے کر بھی کسی ملک کو اپنے زیرِ بار کر کے کیا جاتا ہے۔ جیسے امریکہ کے فیڈرل ریزرو بینک کے حوالے سے مصنف مستنصر حسین تارڑ کا کہنا ہے کہ یہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کی دیواروں میں مٹی یا سیمنٹ سے بنی ہوئی اینٹیں نہیں ہیں بلکہ سونے کی اینٹیں موجود ہیں۔ اس بینک اور اس کی طرف سے دی جانے والی امداد کو مصنف نے طنزیہ انداز اختیار کرتے ہوئے یوں بیان کیا ہے:

> فیڈرل ریزرو بینک دراصل دنیا بھر کے بینکوں کا بینک ہے۔۔۔ اس میں سونے کی شکل میں جو سرمایہ محفوظ ہے ہم تیسری دنیا کے لوگ اس کی مالیت اور حجم کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔۔۔ یوں جانئے کہ یہ جو قدیم طرز کا ایک محل سا نظر آتا ہے جو فیڈرل ریزرو بینک ہے اس کی کھڑکیاں کھل جائیں تو ان میں سے سونے کی لاکھوں اینٹیں ابل ابل کر وال سٹریٹ میں چلنے والوں کو انار کلی کی مانند زندہ درگور کر دیں۔۔۔ ویسے اس بینک سے کبھی کبھار ایک آدھ اینٹ ایشیا اور افریقہ کو امداد کے طور پر عطا کر دی جاتی ہے۔۔۔ اور پھر بھی ہم ان نعمتوں کے لیے امریکہ کے شکر گزار نہیں ہوتے۔۔۔[۳۱]

اسی طرح امریکہ اپنی معیشت کو مضبوط بنانے کے لیے تیسری دنیا کے ممالک میں ایسی پالیسیاں نافذ کرواتا ہے جو اس کے حق میں تو بہتر ثابت ہوتی ہیں اور تیسری دنیا کے ممالک اس کا خمیازہ مختلف چیزوں کی کمی یا مہنگائی کی صورت میں بھگتتے ہیں۔

اسی طرح ابنِ انشا نے بھی مختلف ملکوں کے سفر کے دوران وہاں کے سیاسی نظام کا مطالعہ کیا اور انہیں اپنی تحریروں کا موضوع بنایا۔ ابنِ انشا وہاں کے سیاسی نظام اور تاریخ کا تقابل پاکستان کے ساتھ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ کہ جیسے برطانیہ کی تاریخ میں حالات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کا کہنا ہے کہ پاکستان اور انگلستان کے حکمرانوں میں یہ چیز مشترک ہے کہ دونوں ملکوں کے حکمران طاقت کے بل بوتے پر اقتدار حاصل کرتے ہیں اور اسی کی بدولت اس پر براجمان بھی رہتے ہیں۔

کسی ملک کی خوشحالی کا دارومدار وہاں کے معاشی نظام پر ہوتا ہے۔ ملک کے معاشی استحکام اور عدم استحکام کا انحصار بہت سی باتوں پر ہوتا ہے جن میں کرنسی کی قدر و قیمت، افراطِ زر کی شرح اور مہنگائی میں کمی یا زیادتی وغیرہ شامل ہے۔ انشا نے یورپ و امریکہ کے سفر کے دوران ان ممالک کی معیشت اور معاشی استحکام کے بارے میں معلومات وغیرہ جمع کیں اور ان کا تقابل پاکستان کے معاشی نظام سے کیا اور ان کے درمیان موجود اشتراکات و

اختلافات کے پہلوؤں کو بھی بیان کیا۔ جیسے مختلف چیزوں کی قیمتوں کا اندازہ لگاتے ہوئے مصنف کو معلوم ہوا کہ دونوں ممالک میں مہنگائی بہت زیادہ ہے جس کے سبب اشیا کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں اور دوسرے یہ کہ بازاروں میں خریداری کرتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ جیسے اس کرنسی کی کوئی قدر و قیمت ہی نہیں رہی۔

اسی طرح مستنصر حسین تارڑ نیویارک میں جب میوزیم آف آرٹ میں تاریخ کی تمام چیزوں کو ایک جگہ اکٹھا دیکھتے ہیں تو وہاں موجود آثارِ قدیمہ کو دیکھ کر خوش تو ہوتے ہیں مگر اپنے زمانے کے تہذیبی رویوں، ان کی تہذیبی شناخت کے حوالے سے پریشان بھی نظر آتے ہیں کہ ان آثارِ قدیمہ سے ہمیں وہ تاریخ ملتی ہے جس میں ہم موجود نہیں تھے مگر یہ تمام چیزیں اپنی ایک اہمیت ایک مقام رکھتی ہیں مگر ہماری موجودہ تہذیب اپنی کوئی شناخت، اپنی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

> اگر ان کے کھنڈر دریافت ہو گئے تو۔۔۔ سوائے حرص، لالچ اور منافقت کے۔۔۔۔ پیسے کی ہوس کے۔۔۔۔ مشینوں کے، آلات کے۔۔۔۔۔۔ اور کیا برآمد ہو گا۔۔۔ کوئی لاہور کوئی پشاور بھی برآمد ہو گا۔۔۔ تو کیا ان کے کھنڈروں سے نفرت اور تعصب کے۔۔۔ اور چند زنگ آلود جہادی تلواروں کے۔۔۔۔۔ کچھ اور بھی برآمد ہو گا۔۔۔ البتہ یہ قوی امکان ہے کہ آئندہ زمانوں کے لوگ شاید ہڑپہ، موہنجوڈارو، مہر گڑھ، ٹیکسلا اور تخت بائی کے کھنڈروں کو دوبارہ دریافت کر لیں اور ہم انہی کے حوالے سے پہچانے جائیں اور ہماری کچھ عزت رہ جائے۔۔ البتہ وہ ایک مخمصے میں ضرور پڑ جائیں گے کہ ایسے حیرت بھرے شہر بسانے والے اور مجسموں کے لیے ایسا ذوق رکھنے والے لوگوں کو بعد میں کیا ہوا۔۔۔ درمیان کے ہزار برسوں میں یہ لوگ کیا کرتے رہے۔۔۔۔۔۔ [۱۳]

یعنی قدیم تہذیب کے اندر ہی کچھ ایسے رنگ ہیں جن کی وجہ سے تہذیب کو پہچانا جا سکتا ہے ورنہ آج کی تہذیب کے اندر یہ خاصیت نہیں کہ وہ اپنی کوئی الگ شناخت رکھے۔ اس کے اندر ایسی کوئی خصوصیات موجود نہیں جن کو دیکھ کر بعد کے لوگ حیرت کا شکار ہوں یا اس تہذیب کو جاننے کا تجسس رکھیں۔

حسِ جمال کسی چیز کی خوبصورتی کو محسوس کرنے والی ایسی حس ہے جو سب میں پائی جائے یہ لازمی نہیں۔ لیکن ہم اس خطے سے تعلق رکھتے ہیں جہاں یہ حس سب میں بدرجہ اتم پائی جاتی تھی مگر اب آہستہ آہستہ ختم ہوتی جا

رہی ہے۔ اور اس چیز کا افسوس یا شدت سے احساس مصنف کو اس وقت ہوا جب اس میوزیم کی سیر کرتے ہوئے مصنف نے قدیم وجدید ایجادات واختراعات کو ایک جگہ جمع دیکھا۔

> ہم پچھلے سینکڑوں برس سے حسن اور تخلیق کو پرکھنے اور جانچنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت سے عاری ہو چکے ہیں۔۔البتہ سنگ زنی میں مہارت حاصل کر چکے ہیں۔۔۔ابھی تک یہ طے نہیں کر سکے کہ تصویر اُتروانا بھی جائز ہے کہ نہیں۔۔۔میں سمجھتا ہوں کہ ہم نابینا ہو چکے ہیں۔۔۔کم از کم فنونِ لطیفہ کی پرکھ اور لطف اندوزی کے حوالے سے۔۔۔اور یہ صرف گورے ہیں جو دیدہ بینا رکھتے ہیں۔۔۔۔[۱۳]

امریکیوں کے رویے بہت برے سہی، ان کے حقارت آمیز سلوک کے شکوے سہی مگر جس طرح انہوں نے تاریخ اور دیگر قدیم تہذیبوں کی حفاظت کی وہ قابلِ ستائش ہے۔

نیو یارک ایک ایسا شہر ہے جہاں سڑکوں پر مختلف طرح کے تھیٹر سجائے جاتے ہیں۔ مصنف نے وہاں جو ایک تھیٹر دیکھا وہ تین سیاہ فام لڑکوں نے تعلیم کے نام پر کھیلا تھا۔ جس میں انہوں نے اپنے آپ کو مجبور دکھا کر لوگوں سے کچھ ڈالر وصول کیے اور اسی ایک کھیل کے ذریعے وہاں کے تعلیمی نظام پر تنقید بھی کی۔ اور وہاں کی مہنگی تعلیم کا ذکر بھی ملتا ہے۔

مستنصر کے اس سفر نامے میں ہمیں تقابل کی فضا بھی نظر آتی ہے۔ جیسے تعلیمی نظام کا تقابل کرتے ہوئے مصنف کو اندازہ ہوتا ہے کہ امریکہ جیسے معاشرے میں بچوں کو تعلیم دینے کے، کچھ نیا سکھانے کے انداز بھی نئے ہیں جیسے ڈزنی لینڈ میں بنے ایک "اینمل کنگڈم" میں جہاں بچوں کو جنگلی حیات کا تحفظ مختلف طریقوں سے سکھایا جاتا ہے ویسے ہی مختلف جانوروں کے حوالے سے چھوٹے چھوٹے تھیٹرز کی طرح کے شو منعقد کروائے جاتے ہیں جہاں بچے اس جانور کے حوالے سے مختلف سوالات کرتے ہوئے ان کے متعلق بہت کچھ اس کھیل کھیل میں جان لیتے ہیں۔

مصنف معلومات دینے کے اس مختلف انداز کی تعریف یوں کرتے ہیں:

> پرندوں کے بارے میں امریکی بچوں کو کیسے پُر اثر طریقے سے پڑھایا جا رہا ہے۔۔۔انہیں تعلیم دی جا رہی ہے اور یہ تعلیم اس لمحے شروع ہو جاتی ہے جب ایک بچہ اس دنیا میں آ کر اپنی آنکھیں کھولتا

ہے۔۔۔ اس کے والدین اگرچہ وہ ابھی سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں ہوتا پھر بھی مسلسل آس پاس کی اشیا اور قدرتی مناظر کے بارے میں معلومات فراہم کرتے جاتے ہیں کہ کہیں نہ کہیں ان کا اثر ہو گا ۔۔۔ یہ بچے ایک "نیچرل ہسٹری میوزیم" میں جاکر انسانی تاریخ، پرندوں اور جانوروں کے ارتقا اور تہذیب کے بارے میں دو تین گھنٹوں میں اتنا کچھ جان لیتے ہیں جو ہمارا بچہ پوری عمر نہیں جان سکتا۔۔۔۔۔ والدین ان میں تجسس اور اشتیاق کے بیج بوتے رہتے ہیں۔۔۔۔ یوں ایک بودا سانالائق امریکی بچہ بھی ہمارے باصلاحیت بچوں سے اس مسلسل "تعلیم اور آگاہی" کے زور پر کہیں آگے نکل جاتا ہے۔۔۔۔۔۔ ہمارے بچے ہر شے میں۔۔۔ تنگ نظری، تعصب اور عقیدے میں جکڑ کر شاہ دولا کے چوہے بنا دیئے جاتے ہیں۔۔۔۔ وہ ہر سوال نہیں پوچھ سکتے۔۔ اگر پوچھ لیں تو سرزنش کی جاتی ہے۔۔۔۔۔[۱۵]

یعنی مصنف کے بقول ہمارا تعلیمی نظام ایسا نہیں ہے جو بچوں کو ان کی دلچسپی کے حوالے سے پڑھائے۔ ان کے اندر لگن اور شوق پیدا کرے۔ بلکہ وہ عمر جس میں بچوں کے اندر تجسس کا مادہ زیادہ حد تک پایا جاتا ہے اور اس تجسس کی وجہ سے جب بچے سوال کرنے لگتے ہیں تو ان کو معلومات دینے کی بجائے جھڑک دیا جاتا ہے اور ایسا ہی رویہ ان بچوں کے ساتھ تعلیمی اداروں میں بھی اپنایا جاتا ہے کہ بچے کے سوالات کا تسلی بخش جواب دے کر اس کی تسلی کروانے کی بجائے اسے ڈانٹ ڈپٹ کر خاموش کروا دیا جاتا ہے۔ یوں ہم اس کی نئی چیزوں کو جاننے کی صلاحیت اور اس کی تخلیقی صلاحیت کو اپنے ہی رویوں سے ختم کر دیتے ہیں۔

اسی طرح انشا نے بھی مختلف ممالک کے سفر کے دوران وہاں کے تعلیمی نظام پر بھی نظر رکھی۔ وہ بھی مستنصر حسین تارڑ کی طرح تعلیمی نظام کا تقابل کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ وہاں طالب علموں کے طبعی رجحان کا پتا لگانے کی خاطر ان سے اوائل کا ٹیسٹ لیا جاتا ہے جبکہ پاکستان میں ایسا کچھ بھی نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں جس شخص میں جو صلاحیت موجود ہوتی ہے ہمیشہ اسے الٹ پیشے کا انتخاب کروایا جاتا ہے۔

انشا کے سفر ناموں میں نصاب کا تقابل بھی ملتا ہے۔ انشا کے بقول یورپی ممالک کے تعلیمی نصاب میں سائنسی علوم کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے جبکہ ہمارے ہاں شعر و شاعری کو۔ وہاں کے تعلیمی نصاب میں ایسی چیزیں شامل کی جاتی ہیں جو بچے کو اس کے مستقبل میں کوئی پروفیشن منتخب کرنے کے حوالے سے مدد کر سکتے ہیں۔ انشا بتاتے ہیں کہ مشرق و مغرب کی نوجوان نسل کے صرف تعلیمی نظام میں ہی فرق نہیں ہے بلکہ ان کے کھلونوں میں بھی فرق ہے۔

اس بات کا اندازہ مصنف کو جرمنی کے ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں رکھے کھلونوں کو دیکھ کر ہوا۔ اس ڈیپارٹمنٹل سٹور میں کھلونوں اور پاکستان میں موجود کھلونوں کو دیکھ کر انہیں اختلاف کا پہلو نظر آیا۔ اس اختلاف کو انہوں نے سفر نامہ آوارہ گرد کی ڈائری میں یوں بیان کیا ہے:

> ایمسٹرڈم اور برلن میں ایسے ڈیپارٹمنٹل سٹور دیکھے کہ پوری منزل میں کھلونے ہی کھلونے ہیں۔ ان میں گڑیاں گڈے بھی ہیں۔ لیکن تمام مشینوں کے ماڈل بھی دیکھے جن سے پتہ چلے کہ پسٹن کیا ہوتا ہے، گئیر کیسے کام کرتے ہیں، ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے۔ یہی التزام یہاں کی کتابوں اور کورسوں میں ہے۔[۱۶]

درج بالا حوالے میں انشا نے یہ واضح کیا کہ مغربی ممالک میں بچوں کو کھیل ہی کھیل میں سائنسی معلومات فراہم کی جاتی ہیں جبکہ ہمارے ہاں صرف قصے، کہانی اور المیہ شاعری پر زور دیا جاتا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کے سفر نامے میں جہاں مختلف تہذیبوں اور مختلف معاشروں کے اشتراکات و اختلافات کا بیان ملتا ہے۔ وہیں اس سفر نامے میں اسلوب کی بھی بہت سے خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ جس میں سب سے زیادہ استعمال کی گئی خصوصیت "جزئیات نگاری" ہے۔ اور یہ جزئیات نگاری ہمیں یوں تو پورے سفر نامے میں ہی نظر آتی ہے مگر خاص طور پر جب اس سفر نامے کا وہ حصہ پڑھا جائے جس میں مصنف اپنی بیٹی کے گھر فلوریڈا گئے، وہاں کی خوبصورتی، خاموشی، وہاں کے دل موہ لینے والے قدرتی مناظر کو مصنف نے اس دلکشی اور جزئیات کے ساتھ بیان کیا ہے کہ اکثر پڑھنے والا خود کو اسی ماحول و منظر میں کھڑا محسوس کرتا ہے۔ اور یہ مصنف کی ایک خاصیت ہے کہ انہوں نے سفر نامے کو صرف فارغ وقت میں پڑھی جانے والی چیز نہ رہنے دیا بلکہ اس میں قاری کی دلچسپی کے تمام لوازمات کو اکٹھا کیا۔ اور پورے سفر نامے میں قاری کو اپنے ساتھ جوڑ کر رکھا کہیں بھی کسی بھی جگہ پر اسے اکتاہٹ کا شکار نہ ہونے دیا۔

مستنصر حسین تارڑ کے سفر نامے محض سفری رپورٹ یا گائیڈ بک کی بجائے ایک تخلیقی صنف کے طور پر اپنا انفرادی تشخص قائم رکھے ہوئے ہیں۔ انہوں نے سفر نامہ نگاری کی صنف کو ایک نئی جہت، ایک نیا رنگ عطا کیا ہے۔ ان کے نزدیک سیاحت ایک دیوانگی ہے، ایک آوارگی ہے جس سے ان کی روح سیر اب ہوتی ہے۔

غفور شاہ قاسم اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> تارڑ سر تا پا ایک سیاح ہے۔ اس لیے اس کے لکھے سفر نامے محض اس صنف کی کتابوں کے انبار میں اضافے کا باعث نہیں بلکہ اس کی تخلیقی پہچان اس کے خد و خال اور اس صنف کی بوطیقا وضع کرنے کا موجب بنے ہیں۔ تارڑ کی وجہ سے اردو ادب کی یہ نو خیز صنفِ نثر اردو کی مقبول ترین اصنافِ ادب افسانہ اور ناول سے شانے ملاتی دکھائی دیتی ہے۔ [۱۷]

اس سفر نامے میں ہمیں مصنف کا مزاحیہ انداز بھی نظر آتا ہے کہ قاری کو بوریت سے بچانے کے لیے مصنف نے ایسا انداز اختیار کیا جس سے پڑھنے والا بے اختیار کھکھلانے لگتا ہے۔ جیسے فلوریڈا میں ایک جگہ کی سیر کرتے ہوئے مصنف نے جب وہاں موجود گاڑیوں کی نمبر پلیٹ اور ان پر موجود نشانوں کو بغور دیکھا تو اس میں موجود انوکھے پن کو مزاحیہ انداز اختیار کرتے ہوئے یوں بیان کیا:

> پارکنگ لاٹ میں جتنی بھی کاریں اور جیپیں پارک کی گئی تھیں اُن میں سے بیشتر کی نمبر پلیٹوں پر مالٹے کی شبیہ بنی ہوئی تھی کہ یہ علاقہ اورنج کاؤنٹی کا تھا۔۔۔۔ اورنج یا مالٹوں کے باغ تو کب کے نابود ہو چکے اور صرف کاؤنٹی باقی رہ گئی ہے اور اس کے باوجود یہاں کا امتیازی نشان اورنج ہی تھا۔۔۔۔ اگر پاکستان میں بھی یہی رواج ہو کہ ہر علاقے کی نمبر پلیٹوں پر وہاں کی معروف پیداوار کے حوالے سے کوئی تصویر بنی ہو تو آپ دور سے آتی کار یا بس وغیرہ کی نمبر پلیٹ دیکھ کر جان سکتے ہیں کہ یہ کہاں سے آ رہی ہے۔۔۔ مثلاً کراچی کی نمبر پلیٹ پر پان کی پیک کیا ہی بہار دکھائے گی۔۔۔ حیدر آباد کی نمبر پلیٹ پر چوڑیاں سجی ہوں گی۔۔۔ ملتان کی نمبر پلیٹ کے بارے میں فیصلہ نہ ہو پائے گا کہ اس پر کپاس کا پھول ہو، آم ہو۔۔۔ کوئی سلونی شکل ہو یا صرف دھول ہو۔۔۔ لاہور کی کار بھی یوں پہچانی جائے گی کہ اُس پر مُرگ دے کپورے نقش ہوں یا ایک پیٹو شخص کی تصویر نقش ہو گی۔۔۔ گوجرانوالہ کی نمبر پلیٹ پر یا تو ایک پہلوان ہو گا اور یا بھنے ہوئے چڑے۔۔۔۔ یوں ہر شہر، ہر ضلع کے بارے میں بے شمار ممکنات ہیں لیکن اسلام آباد کی نمبر پلیٹ کے بارے میں متفقہ فیصلہ ہو گا کہ اس پر ایک لوٹے کی تصویر ہو گی۔۔۔۔۔ [۱۸]

یوں مزاحیہ انداز اختیار کرتے ہوئے مصنف نے جا بجا قاری کی دلچسپی کے لیے ہلکا پھلکا مزاح تخلیق کیا ہے۔

سفرنامہ نیویارک کے سو رنگ میں یوں تو سبھی رنگ قابلِ مشاہدہ ہیں۔ اپنے اس سفرنامے میں مصنف فلیش بیک کی تکنینک نہایت کامیابی سے برتتے ہیں۔ نیویارک کی تہذیب و ثقافت کو دیکھتے ہیں تو ساتھ ہی لاہور کے رسم ورواج کو بھی یاد کرتے نظر آتے ہیں۔

اس سفرنامے میں مستنصر حسین تارڑ کا طنزیہ و مزاحیہ اسلوب بھی نظر آتا ہے۔ ان کے اسلوب میں تازگی، سچائی، دلکشی اور رعنائی ملتی ہے۔ منظر نگاری کرتے ہوئے وہ لفظوں کی ایسی جادوئی بنت کرتے ہیں کہ پڑھنے والا خود کو اس مقام اور منظر کا حصہ محسوس کرتا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کے دلکش اسلوب کی بدولت اکثر ان کے سفرناموں میں افسانویت کا رنگ بھی جھلکنے لگتا ہے۔ کہیں وہ قاری کو حقیقت سے قریب لے آتے ہیں اور کہیں الفاظ کی جادوئی بنت کرتے ہوئے افسانوی دنیا میں لے جاتے ہیں۔

ذوالفقار علی کا کہنا ہے:

> ان کے سفرناموں میں مقامات اور واقعات کا تنوع ان کی کامیابی کا باعث ہے۔ یورپ کی رنگینی و دلکشی کا بیان ہو یا اندرونِ ملک خوبصورت پہاڑی علاقوں کے حسن کا ذکر، ان کا اسلوب انفرادیت کا حامل ہے۔[۱۹]

مصنف کی تحریر کے اختتام پر اس چیز کا افسوس بھی ملتا ہے کہ کس طرح انسان نے اپنی آسائش کی خاطر اور دولت کے حصول کے لیے قدرتی مناظر کی خوبصورتی کو خراب کیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ غفور شاہ قاسم،مستنصر حسین تارڑ : شخصیت و فن،ص۲۲۷۔

۲۔ سیموئیل پی۔ ہنٹنگٹن،تہذیبوں کا تصادم،احسن بٹ(مترجم)،(لاہور:مثال پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۳ء)،ص۷۹۔

۳۔ ایضاً،ص۱۶۲۔

۴۔ بانو قدسیہ،حاصل گھاٹ(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۸ء)،ص۱۳۲۔

۵۔ ایضاً،ص۳۱۲۔

۶۔ سیموئیل پی۔ ہنٹنگٹن،تہذیبوں کا تصادم،احسن بٹ(مترجم)،ص۸۴۔

۷۔ مستنصر حسین تارڑ،نیو یارک کے سو رنگ،ص۵۵۔

۸۔ ایضاً،ص۳۱۸۔

۹۔ سیموئیل پی۔ ہنٹنگٹن،تہذیبوں کا تصادم،محمد احسن بٹ(مترجم)،ص۹۹۔

۱۰۔ ایضاً،ص۱۶۳۔

۱۱۔ ایضاً،ص۱۶۴۔

۱۲۔ مستنصر حسین تارڑ،نیو یارک کے سو رنگ،ص۶۷۔

۱۳۔ ایضاً،ص۲۰۱۔

۱۴۔ ایضاً،ص۱۶۹۔

۱۵۔ ایضاً،ص۵۰۲۔

۱۶۔ ابنِ انشا،آوارہ گرد کی ڈائری،طبع دوازدہم،(لاہور:لاہور اکیڈمی،۱۹۸۵ء)،ص۱۵۱۔

۱۷۔ غفور شاہ قاسم،مستنصر حسین تارڑ: شخصیت اور فن،ص۳۱۔

۱۸۔ مستنصر حسین تارڑ،نیو یارک کے سو رنگ ،ص۴۵۶۔

۱۹۔ ذوالفقار علی،"مستنصر حسین تارڑ کی سفر نامہ نگاری میں افسانوی عناصر"مشمولہ بازیافت،لاہور (جنوری تاجون۲۰۱۵ء)۔

ماحصل

ماحصل

مستنصر حسین تارڑ اردو ادب کی دنیا میں ایک ہمہ جہت شخصیت کی حیثیت سے اپنا منفرد نام اور مقام رکھتے ہیں۔ وہ ایک ناول نگار، کالم نگار، سفر نامہ نگار، ڈرامہ نگار، بطور اداکار اور ٹی وی میزبان اپنی ایک علیحدہ پہچان رکھتے ہیں۔ اب ان کا علم، فہم اور ادراک ایک محقق اور تاریخ شناس ہونے کی گواہی بھی دیتا ہے۔ انہوں نے جس بھی میدان میں قدم رکھا وہاں کامیابی کے جھنڈے گاڑے اور اپنے پیش رو کے لیے نئی جہت اور نئے انداز متعارف کرواتے چلے گئے۔ ان کی شخصیت کے یوں تو بہت سے رخ ہیں، لیکن ہمارے اس تحقیقی کام میں ان کی شخصیت بطور سفر نامہ نگار ہی ہمارے سامنے رہی۔ جس میں ہم نے ان کے ایک سفر نامے نیو یارک کے سو رنگ کو ایک مختلف انداز میں دیکھنے کی کوشش کی۔ انہوں نے سفر نامہ نگاری کے میدان کو ایک نئی سمت ایک نئی صورت عطا کی، اردو ادب میں سفر نامہ لکھنے کے لیے ایک ایسا انداز متعارف کروایا جس کی پیروی میں کئی سفر نامے تخلیق کیے گئے۔ انہوں نے سفر نامہ جیسی صنف میں ایسے انداز کی بنیاد ڈالی جو اس سے پہلے موجود نہ تھی۔ انہوں نے سفر نامہ کو دلچسپ، پر مزاح، آسان اور سلیس تحریر سے ادب میں سفر ناموں کے قارئین کی ایک کثیر تعداد پیدا کی۔ منظر نگاری کرتے ہوئے وہ الفاظ کی ایسی جادوئی بنت کرتے ہیں کہ پڑھنے والا اس مقام و منظر سے بھرپور واقفیت حاصل کر لیتا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ نے اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک بہت سے سفر اختیار کیے۔ ان تمام سفروں کے دوران وہ محض ایک عام آدمی کی طرح چیزوں کو دیکھتے نہیں چلے جاتے بلکہ ان کے متعلق تمام معلومات بھی جمع کرتے ہیں اور بعد میں اپنا سفری احوال تمام حقائق کے ساتھ اس انداز میں بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کو اکتاہٹ کا احساس نہیں ہوتا بلکہ وہ مصنف کے ساتھ ساتھ تمام چیزوں کی رنگینیوں اور خوبصورتیوں کو محسوس کرتا ہے۔

مصنف جب اندرونِ ملک کے سفر اختیار کرتے ہیں تو وہاں کی خوبصورتیوں کو اپنی تحریر کا حصہ بناتے ہیں اور کسی علاقے کی مخصوص تاریخ یا اس کی وجہ شہرت کے حوالے سے بھی معلومات فراہم کرتے ہیں۔ بیرونِ ملک کی جانب کیے گئے سفروں میں بھی وہ تاریخ اور اس کی خوبصورتیوں کو تو شامل کرتے ہی ہیں اس کے ساتھ ساتھ وہاں کی تہذیب و ثقافت، وہاں کے رسم و رواج، جغرافیہ، زبان، علم و ادب اور وہاں موجود لوگوں کے مشاہدات کو بھی اپنے

سفر ناموں میں ایسے انداز میں بیان کرتے ہیں جو قاری کی دلچسپی کا سامان بنتے ہے۔ ان کے سفر ناموں میں ہمیں ان کا مشاہدہ اور تخلیقی عمل دونوں نظر آتے ہیں۔ جب وہ اپنے سفر ناموں میں دو تہذیبوں کے مختلف مناظر اور خصوصیات کو بیان کرتے ہیں تو اس لمحے تیسری دنیا کے باسی کی محرومیاں اور ناکامیاں بھی اس میں شامل ہونے لگتی ہیں۔ ان کے سفر ناموں کے مطالعے سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سفر نامے زندگی کا مسلسل اور متحرک بیانیہ ہیں۔

موجودہ تحقیقی مقالے میں مستنصر حسین تارڑ کے سفر نامے نیو یارک کے سو رنگ میں موجود تہذیبی اختلافات کا مطالعہ سیموئیل پی۔ ہنٹنگٹن کی پیش کردہ تھیوری "تہذیبوں کا تصادم" کے حوالے سے کیا گیا ہے۔

سیموئیل نے پہلے پہل یہ تھیوری اپنے ایک مقالے میں پیش کی۔ کچھ عرصے بعد انہوں نے اس مقالے میں موجود اپنے نظریات کو توسیع دی اور انہیں ایک کتاب کی صورت میں پیش کیا جسے *The Clash of Civilizations and Remaking of world Order* کا نام دیا۔

سیموئیل کا یہ کہنا ہے کہ سرد جنگ کے اختتام کے بعد دنیا کے اندازِ فکر میں واضح تبدیلی آئی ہے۔ دنیا میں اب جنگیں ایٹمی ہتھیاروں کی یا مختلف ممالک کے درمیان طاقت کے دکھاوے کی نہیں بلکہ تہذیبوں اور ثقافتوں کے مابین لڑی جائیں گی۔ تہذیب سے مراد اقدار کا ایسا نظام ہے جو مختلف سطحوں پر معاشرے کے رویے کی تشکیل کرتا ہے جبکہ ثقافت انسان کے بنائے ہوئے ماحول میں نظر آتی ہے۔ تہذیب معاشرے کا دماغ اور ثقافت جسم ہے۔ کسی بھی خطے کا ادب اس کی تہذیبی خصوصیات کا مظہر ہوتا ہے۔ مثلاً اسلامی ممالک میں تحریر ہونے والا ادب اسلامی تہذیب کا عکس پیش کرے گا اور مغرب میں تحریر ہونے والا ادب مغربی تہذیب کی رنگینیوں کو پیش کرے گا۔ پاکستانی تہذیب اور امریکی تہذیب میں ہمیشہ اختلافات رہے ہیں۔ ان اختلافات کی بنیادی وجہ ان تہذیبوں کے فلسفیانہ افکار ہیں۔ اسلامی تہذیب کے فلسفہ فکر کے مطابق اس تہذیب کی بنیاد روحانیت کے افکار و نظریات پر قائم ہے جبکہ مغربی تہذیب کے فلسفہ فکر کے مطابق مغربی تہذیب کی بنیاد مادیت پرستی پر قائم ہے۔ مغربی تہذیب نے مذہب سے رشتہ توڑ کر روحانیت سے منہ موڑ کر ایک ایسی تہذیب کی بنیاد رکھی ہے جسے لادینیت اور مادہ پرستی کی دیمک چاٹ رہی ہے۔ مغربی ممالک صنعتی اور تجارتی لحاظ سے تو ترقی یافتہ ہیں مگر ان کی اخلاقی اقدار زوال کا شکار ہیں۔

مغرب کا یہ ماننا ہے کہ دنیا کو ایک ہی تہذیب و ثقافت اور رسم و رواج کے جھنڈے تلے جمع کر دیا جائے اور وہ تہذیب جسے آفاقی تہذیب کا نام دیا جائے وہ اور کوئی تہذیب نہیں بلکہ مغربی تہذیب ہو۔ یعنی مغربی تہذیب کو آفاقی تہذیب کے طور پر قبول کیا جائے۔ باقی تمام تہذیبیں اپنی اقدار و روایات کو چھوڑ کر مغربی تہذیب کو اپنائیں۔ اپنی تہذیب کو آفاقی تہذیب ثابت کروانے کے لیے مغربی تہذیب اپنی طاقت کا استعمال کر رہی ہے۔ وہ اپنی طاقت کے بل بوتے پر اپنی اس تہذیب کو تمام دنیا پر رائج کرنا چاہتا ہے جس کی اپنی کوئی بنیاد نہیں ہیں اور نہ ہی کوئی اقدار و روایات ہیں جن پر لوگ عمل کر سکیں۔

سیموئیل کے نزدیک تہذیبی اختلافات کی ایک وجہ مختلف کلچرز ہیں۔ پاکستان ایک اسلامی ملک ہے یہاں اسلامی کلچر رائج ہے اور اسلامی کلچر ان اقدار و روایات کا مجموعہ ہے جس پر عمل کرتے ہوئے ایک اسلامی معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو اخوت، مساوات، رواداری، دوسروں کے حقوق کا تحفظ جیسی اقدار کو فروغ دیتا ہے۔ جس سے معاشرے میں امن و سکون قائم رہتا ہے۔ امریکہ میں مختلف قومیں آباد ہیں۔ وہاں نہ تو کوئی ایک مذہب ہے نہ کوئی ایسی حدود و قیود ہیں جن کی وجہ سے معاشرے میں امن و سکون قائم رہ سکے۔ امریکی معاشرے میں ہر طرف لادینیت کا راج ہے۔ وہاں کسی کو مذہب یا کسی اخلاقی حد کا پابند نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے باوجود مغرب یہ چاہتا ہے کہ اس کی تہذیب کو آفاقی تہذیب تسلیم کیا جائے۔ اس ضد کی وجہ سے بھی تہذیبی تصادم رونما ہوتے ہیں جب ایک ملک دوسرے ملک کی تہذیب و ثقافت کو ختم کرنے کی بات کرتا ہے، کیونکہ تہذیب وہ خصوصیت ہے جس کی وجہ سے ایک معاشرہ اپنی الگ شناخت قائم رکھ سکتا ہے۔ اور جب ایک تہذیب دوسری تہذیب کی خصوصیات کو ان کے فرق کے ساتھ قبول کرنے کی بجائے اپنی تہذیب و ثقافت کو زبردستی مسلط کر کے اس ملک کی الگ شناخت ختم کرنا چاہے تب بھی تہذیبی اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔

یہ کام غالب تہذیب زبردستی اپنا تسلط قائم کرنے کے علاوہ دوسری تہذیبوں کے حامل لوگوں میں احساسِ کمتری پیدا کر کے بھی کرتی ہے اور یہ احساسِ کمتری زبان و ادب کے حوالے سے، مختلف تعمیرات کے حوالے سے بھی ہو سکتا ہے۔ جیسے مصنف امریکہ میں موجود میوزیمز اور لائبریریوں کو دیکھ کر احساسِ کمتری کو شکار ہوتا اور مغربی تہذیب کی برتری کو تسلیم کرتا ہے۔ اس احساسِ کمتری اور احساسِ برتری کی وجہ سے بھی تہذیبی اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔ اس سفرنامے میں مصنف نے جابجا ایسے تقابل کیے ہیں جن کی وجہ سے وہ مغربی تہذیب کی برتری کو تسلیم کرتا ہے اور مشرقی تہذیب کو کمتر خیال کرتا ہے۔

سیموئیل کے نظریے کے مطابق اکثر جغرافیائی حدود مختلف ہونے سے بھی تہذیبی تصادم پیدا ہوتے ہیں۔

نیو یارک کے سو رنگ میں بھی جغرافیائی حدود کے مختلف ہونے کی وجہ سے تہذیبی اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔ پاکستان کے رسم ورواج، اقدار وروایات، ماحول اور موسم امریکہ سے مختلف ہیں۔ جو قومیں امریکہ میں آباد ہیں وہ پاکستان میں آباد نہیں۔ وہاں کے لوگوں کا رہن سہن، خوراک اور لباس مختلف ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ جب نیویارک کی سڑکوں پر پھر رہے ہوتے ہیں تو وہ لوگوں کی مختلف عادات واطوار کا، ان کے لباس کا موازنہ پاکستان سے کرتے ہیں۔ وہ کبھی امریکی زندگی کا جائزہ لیتے ہیں اور کبھی پاکستانی زندگی کا۔ وہ دیکھتے ہیں کہ نیویارک میں پھرنے والے ہر شخص کو اپنی زندگی، اپنے حالات وواقعات سے مطلب ہے جبکہ پاکستان میں ایسا کچھ نہیں وہاں سب اپنی ذمہ داریوں کو چھوڑ کر دوسروں کی زندگیوں میں دخل اندازی کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔

سیموئیل کے نزدیک تہذیبی اختلافات کی ایک وجہ مذہب بھی ہے۔ تیسری دنیا میں زیادہ تر اسلامی ممالک شامل ہیں۔ جہاں کہ مجاہدین کو دہشت گرد قرار دیا جاتا ہے۔ روحانی ترقی کے خواہش مند افراد کو بنیاد پرست کہا جانے لگتا ہے۔ اگر امریکہ کے جدید فکری تناظر میں مذہب ہر شخص کا ذاتی مسئلہ ہے تو پاکستان کا ہر مجاہد انہیں دہشت گرد کیوں نظر آتا ہے۔ گیارہ ستمبر والے واقعہ کو بنیاد بنا کر کیوں مسلمانوں کی نسل کشی کی جارہی ہے؟ دہشت گردی کے نام پر صرف مسلمان ممالک پر کیوں ہر طرح کے ظلم ڈھائے جارہے ہیں؟ کیوں عراقیوں کو کسی وجہ کے بغیر بے دریغ قتل کیا جارہا ہے؟ اس کی ایک وجہ یہی نظر آتی ہے کہ امریکی تہذیب نے بظاہر اپنے اوپر دکھاوے کا ایک خول چڑھا رکھا ہے۔ درحقیقت وہ مذہب اسلام کی تعلیمات اور اس کے پھیلاؤ سے خوفزدہ ہیں۔ اور اپنے اسی خوف کی وجہ سے وہ مسلمانوں کی نسل کشی کر رہے ہیں، محض ایک واقعہ کو بنیاد بنا کر حکومت ہمدردی حاصل کرتی ہے اور مسلمانوں پر ظلم ڈھاتی ہے۔

انگریزوں کے نو آبادیاتی نظام نے بھی اسلام کی ثقافتی روایات کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔ نو آبادیاتی نظام سے مراد کسی ایک علاقے کے لوگوں کا دوسرے علاقے میں جا کر اپنی نئی آبادیاں قائم کرنا اور اردگرد کے علاقوں پر قبضہ کر کے اسے توسیع دینا ہے۔ جہاں یہ نو آبادی قائم کی جاتی ہے وہاں کے اصل باشندوں پر قابض گروہ عموماً اپنے قوانین، معاشرت اور حکومت بھی مسلط کر دیتے ہیں۔ بنیادی طور پر یہ قابض گروہ اور نو آبادی کے اصل باشندوں کے درمیان ناانصافی اور جبر پر مبنی ایک تعلق ہے جس میں اصل باشندوں کا استحصال ہوتا ہے۔ اسی نظام کے

تحت انگریزوں نے مذہب اسلام کو بھی ختم کرنے کی ناکام کوشش کی۔ مذہب اسلام کے ماننے والوں کو بے جا تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔

سیموئیل کے نزدیک تہذیبی اختلافات کی ایک اور بڑی وجہ معاشی و سیاسی مفادات بھی ہیں۔ امریکی تہذیب اور اسلامی تہذیب میں اختلافات شروع ہی سے موجود ہیں اب یہ اختلافات مختلف نوعیت اختیار کرتے چلے جا رہے ہیں۔ جیسے معاشی و سیاسی عدم استحکام کسی ملک کے تباہ و برباد ہونے کی وجہ بنتے ہیں۔ اسی وجہ کو استعمال کرتے ہوئے امریکی تہذیب ایسے معاشی و سیاسی اصول و قوانین بناتی ہے جو اس کی معیشت کو تو تحفظ فراہم کرتے ہیں جبکہ دیگر ممالک کو اس کا غلام بنا دیتے ہیں۔ جیسے آئی۔ ایم۔ ایف اور دیگر قرض دینے والے اداروں کی پالیسیاں بظاہر تو ایسی ہوتی ہیں کہ وہ اس ملک کو مدد فراہم کر رہی ہیں جبکہ در حقیقت یہ پالیسیاں اس ملک کو قرض کی ایسی زنجیروں میں جکڑ دیتی ہیں کہ ان سے آزادی تقریباً ناممکن ہی نظر آتی ہے۔ اسی طرح اسلحہ سازی کے حوالے سے امریکہ نے ایک پالیسی ترتیب دے رکھی ہے جس میں کچھ ممالک اسلحہ خود نہیں بنا سکتے بلکہ ان کے تمام وسائل کا استعمال کرتے ہوئے امریکی خود اسلحہ بناتے ہیں اور اسی اسلحے کو اسی ملک میں مہنگے داموں فروخت کر کے اپنی معیشت کو مضبوط اور دوسرے ملک کی معیشت کو کمزور کر دیتے ہیں۔

اپنی غالب معیشت کو برقرار رکھنے کے لیے مغرب اپنے مفادات کو "عالمی برادری کے مفادات" کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ اور تمام ایسے اقدامات کو درست ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اسی طرح مغرب جمہوریت کو تو فروغ دیتے ہیں لیکن اس کو استعمال کرتے ہوئے قابض ممالک میں ایسی حکومتیں لاتے ہیں جو پس پردہ اس کے مفادات کی حفاظت کرے اور اس کے غلط اقدامات کو بھی درست بنا کر پیش کرے۔ دوسرے ممالک میں وہ صرف اس جمہوریت کو پسند کرتا ہے جو مغرب نواز حکومتوں کو اقتدار میں لائے۔ تاکہ وہ اپنی مرضی کے اصول ان ممالک میں رائج کر سکے۔ جیسے ایران اور عراق کے لیے ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو روکنے کے احکامات جاری کیے جاتے ہیں جبکہ اسرائیل کی طرف سے کی گئی کسی زیادتی کے جواب میں ایسا کوئی حکم اس کے لیے جاری نہیں کیا جاتا۔

الغرض مستنصر حسین تارڑ نے اپنے اس سفر نامے میں مشرقی اور مغربی تہذیب و ثقافت کا مختلف حوالوں سے تجزیہ کیا۔ مغربی تہذیب کی یلغار تیسری دنیا کے باشندوں کو اپنا اسیر بناتی جا رہی ہے اور انہیں اپنی تہذیب میں

محض خامیاں نظر آتی ہیں۔ وہ اپنی تہذیب کو دقیانوسی اور گھٹیا سمجھنے لگتے ہیں۔ وہ مغرب کے شخصی آزادی اور مذہبی آزادی کے تصور کے بت کی پوجا کرنے لگتے ہیں۔

اس کے علاوہ مغرب کی طاقت اور اس کے مقام کو دیکھتے ہوئے مصنف کے اندر کہیں کہیں ایک احساسِ کمتری بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیوں مسلمان اپنی تعلیمات سے دور ہو کر دنیا میں رسوا ہو رہے ہیں۔ اگر مسلمان اپنے اصل کی طرف لوٹ جائیں تو یقیناً دنیا میں اپنا کھویا ہوا مقام و مرتبہ دوبارہ حاصل کر لیں گے۔ وہ عزت دوبارہ ان کا مقدر بن جائے گی جو پہلے کبھی ان کے آباؤ اجداد کا خاصہ تھی۔

کتابیات

کتابیات

آغا،وزیر۔سفرنامے کی بحث۔مشمولہ اوراق،سالنامہ،لاہور،۱۹۷۴ء۔

احمد،سعید۔آزادی کے بعد اردو سفر نامہ(تنقید و تجزیہ)۔دہلی:عرشیہ پبلی کیشنز،۲۰۱۲ء۔

احمد،محمد۔تعارف تہذیبِ مغرب اور فلسفہ جدید۔فیصل آباد:جامعہ اسلامیہ،۲۰۱۴ء۔

اجمل،محمد۔بہترین سفرنامے مرتبہ ذوالفقار احمد تابش،لاہور،۱۹۷۶ء۔

اختر،سلیم۔ادب اور کلچر۔لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۲ء۔

اختر،سلیم۔ہمارے ہاتھ قلم ہوئے۔لاہور:مغربی پاکستان اردو اکیڈمی،۱۹۹۵ء۔

اکرم،شیخ محمد۔پاکستان کا ثقافتی ورثہ۔مترجم افتخار احمد شروانی۔لاہور:ادارہ ثقافتِ اسلامیہ،۲۰۰۱ء۔

الظفر،معید۔تہذیبی تصادم اور فکرِ اقبال۔سرینگر:انسٹی ٹیوٹ آف کشمیر،۲۰۰۴ء۔

انشا،ابنِ۔آوارہ گرد کی ڈائری۔لاہور:لاہور اکیڈمی،۱۹۸۵ء۔

انصاری،احمد۔ادب اور تنقید۔الہ آباد:سنگم پبلشرز،۱۹۶۸ء۔

بارن ہارٹ(Barnhart)۔

The world book dictionay۔جلد:اول۔شکاگو:سکاٹ فیٹزر کمپنی۔۱۹۸۳ء۔

بیگ،حامد۔اردو سفر نامے کی مختصر تاریخ۔لاہور:کلاسیک،۱۹۹۹ء۔

پروازی،پرویز۔سفرنامے کی تاریخ اور اس کا فن۔مشمولہ اوراق،ماہنامہ لاہور:۱۹۸۹ء۔

تارڑ،مستنصر حسین۔خانہ بدوش۔لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۱۹۸۵ء۔

تارڑ،مستنصر حسین۔کالاش(وادئ کافرستان کا ڈرامائی سفر)۔لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء۔

تارڑ،مستنصر حسین۔نکلے تری تلاش میں۔لاہور:سیارہ ڈائجسٹ،۱۹۷۲ء۔

تارڑ،مستنصر حسین۔نیویارک کے سو رنگ۔لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۸ء۔

تارڑ،مستنصر حسین۔ہنزہ داستان۔لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۱۹۸۷ء۔

تارڑ،مستنصر حسین۔ہیلو ہالینڈ۔لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۱ء۔

تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند(اردو ادب)جلد پنجم۔لاہور:پنجاب یونیورسٹی۔

جعفری، سید ضمیر (بانی ومدیر)۔چہار سو۔راولپنڈی: جلد ۲۴، شمارہ مارچ، اپریل، ۲۰۱۵ء۔

حسن، اختر ملک۔تاریخ ادبِ اردو۔لاہور: یونیورسٹی بک ایجنسی، ۱۹۷۹ء۔

حسن، سید سبط۔پاکستان میں تہذیب کا ارتقا۔کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۸۹ء۔

حسینی، انور کمال۔فن اور تنقید (مرتبہ)۔دہلی: خرام پبلی کیشنز، ۱۹۷۶ء۔

دستی، محمد شیراز۔ساسا۔لاہور: عکس پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء۔

درانی، عطش۔اسلامی فکر اور ثقافت۔لاہور: کتبہ عالیہ، ۱۹۸۰ء۔

درانی، عطش۔اصنافِ ادب کی مختصر تاریخ۔لاہور: میری لائبریری، ۱۹۸۶ء۔

ڈیورانٹ، ول۔انسانی تہذیب کا ارتقا۔مترجم تنویر جہاں۔لاہور فکشن ہاؤس، ۲۰۰۴ء۔

ربی، ابراہیم۔ایم۔ابو(Rabi،Ibrahim M.Abu)مرتب۔ *Islamic Resurgence: Challenges, Directions and Future perspectives*۔انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، ورلڈ اینڈ اسلام اسٹڈیز انٹر پرائز۔۱۹۹۵ء۔

رضوی، حسن۔گفت و شنید۔لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء۔

رفیق، حذافہ۔عصری تہذیبی تصادم اور فکر اقبال کا تجزیاتی مطالعہ۔پی ایچ ڈی علوم اسلامیہ۔لاہور: جامعہ پنجاب، ۲۰۱۰ء۔

سالواڈوری، مسیمو۔امریکہ کا سرمایہ دارانہ نظام۔دہلی: حالی پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۵۴ء۔

سدید، انور۔اردو ادب میں سفر نامہ۔لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۸۷ء۔

سدید، انور۔اردو ادب کی مختصر تاریخ۔اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۱ء۔

عبدالرحمن، منشی۔قوم اور مذہب۔امرتسر: پبلک بک ڈپو، س۔ن۔

علی، ذوالفقار۔مستنصر حسین تارڑ کی سفر نامہ نگاری میں افسانوی عناصر، بازیافت، لاہور شمارہ ۲۶، ۲۰۱۵ء۔

علی، حیدر۔دنیا کی سیر۔کراچی: سرفراز قومی پریس، ۱۹۶۳ء۔

علی شاہ، سید۔ادب اور تنقید۔کراچی: مکتبہ اسلوب، ۱۹۶۲ء۔

غلام ثقلین، خواجہ۔روزنامچہ سیاحت۔میرٹھ: تجارتی پریس، ۱۹۱۲ء۔

غزنوی، خاطر۔جدید اردو ادب۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۵ء۔

فیروزالدین، مولوی (مرتب)۔فیروز اللغات۔لاہور: فیروز سنز، ۲۰۰۵ء۔

فیض، فیض احمد۔ ہماری قومی ثقافت۔ کراچی: ادارہ یادگارِ غالب، ۱۹۷۶ء۔
قاسم، غفور شاہ۔ مستنصر حسین تارڑ : شخصیت اور فن۔ اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۱۸ء۔
قدسیہ، بانو۔ حاصل گھاٹ۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء۔
قریشی، قدسیہ۔ اردو سفرنامے انیسویں صدی میں۔ لکھنؤ: نصرت پبلشرز، ۱۹۸۶ء۔
قریشی، جازب۔ شاعری اور تہذیب۔ کراچی: مکتبہ کامران، ۱۹۸۸ء۔
کامران، طاہر۔ کلونیل ازم : نظریہ اور برصغیر پر اس کا اطلاق۔ م۔ن، س۔ن
محمود، خالد۔ اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ۔ نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۱۱ء۔
نارنگ، گوپی چند (مرتب)۔ بیسویں صدی میں اردو ادب۔ نئی دہلی: ساہتیہ اکادمی، ۲۰۰۲ء۔
ناز، ارم۔ پاکستانی اور بیرونی ممالک کے اشتراکات و اختلافات ابنِ انشا کے سفر ناموں میں۔ ایم ایس اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد۔
نواز، حق۔ اردو ادب بیسویں صدی میں۔ لاہور: خورشید مقبول پریس، ۲۰۰۶ء۔
وائلڈ، ہینری سیسل (Wyld, Henry Cecil)۔ *The Universal English Dictionary*۔ روٹلیج: ۱۹۵۶ء۔
ہاشمی، رفیع الدین۔ اصنافِ ادب۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء۔
ہنٹنگٹن، سیموئیل فلپس (Huntington, Samuel Philips)۔ *The clash of civilizations and the remaking of world order*۔ نیویارک: سائمن اینڈ چیسٹر۔ ۲۰۰۳ء۔
ہنٹنگٹن، سیموئیل فلپس۔ تہذیبوں کا تصادم اور عالمی نظام کی تشکیل نو مترجم سہیل انجم۔ اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء۔
ہنٹنگٹن، سیموئیل فلپس۔ تہذیبوں کا تصادم مترجم محمد احسن بٹ۔ لاہور: مثال پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۳ء۔
ہنٹنگٹن، سیموئیل فلپس۔ The clash of civilizations مشمولہ: فارن افیئرز سمر، ۱۹۹۳ء۔

انٹرنیٹ ریسورسز(Internet Resources):

Www. Wikipedia .org

https://www.aikrozan.com/

https://www.mukaalma.com/91016/

https://www.humsub.com.pk/

http://www.fikrokhabar.com/

https://islamojadidiat.wordpress.com/

https://www.tajziat.com/

International Islamic Univ
CENTRAL LIBRARY
ISLAMABAD